(Posted on July 20, 2006)

پاکستان

بین الاقوامی مذہبی آزادی

(جمہوریت، انسانی حقوق اور محنت کے بیورو کی طرف سے جاری کردہ رپورٹ برائے 2005)

پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہے۔ اس کے آئین میں لازم قرار دیا گیا ہے کہ تمام قوانین، اسلام کے مطابق ہونے چاہئیں۔ آئین کہتا ہے: ”قانون، امن عامہ اور اخلاقیات کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہر شہری کو اپنے مذہب کا اظہار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی اجازت ہوگی۔“ تاہم عملاً صورتحال یہ ہے کہ حکومت، مذہبی آزادی پر پابندیاں عائد کرتی رہتی ہے۔ اسلام کو ریاست کے مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔ آزادی تقریر کے بارے میں آئین میں کہا گیا ہے کہ ”احترام اسلام“ کی خاطر آزادی تقریر پر معقول حد تک قانونی پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔“ پاکستان، مسلمانوں کے وطن کے طور پر قائم کیا گیا تھا، تاہم اِس کے بانیان، اسے ایک اسلامی ریاست نہیں بنانا چاہتے تھے۔

اس رپورٹ میں جس عرصے کا احاطہ کیا گیا ہے، اس کے دوران حکومت نے مذہبی اقلیتوں کے ساتھ برتاؤ میں بہتری لانے کے لئے بعض اقدامات کئے، تاہم سنگین مسائل موجود رہے۔ حکومت نے مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا پوری طرح تحفظ نہیں کیا۔ مختلف العقیدہ لوگوں کے خلاف امتیازی قوانین کی موجودگی اور ان لوگوں سے معاندانہ سماجی رویے رکھنے والی قوتوں کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی نہ ہونے کی وجہ سے مذہبی عدم رواداری بڑھی اور مذہبی اقلیتوں کے خلاف تشدد اور انھیں ڈرانے دھمکانے کے واقعات پیش آئے۔

احمدیوں کے مذہبی شعائر کی ادائیگی پر عائد قانونی پابندیاں برقرار رہیں۔ اگرچہ دوسری مذہبی اقلیتیں بالعموم آزادی سے اپنے مذہب پر عمل کرتی رہیں، لیکن ان کے ارکان کو اکثر سرکاری امتیازی برتاؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض مسلمان فرقوں کے لوگوں نے بھی بتایا کہ حکومت نے ان سے امتیازی سلوک کیا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے عملے نے مذہبی اقلیتوں سے دوران حراست ناروا سلوک کیا، جس کے نتیجہ میں بعض کی موت تک واقع ہوگئی۔ سیکورٹی فورسز اور دوسرے سرکاری اداروں نے اقلیتوں کو سماجی ناانصافی سے بچانے کے لئے مناسب انتظامات نہیں کئے۔ مذہبی اقلیتوں سے امتیاز برتنے والی سرکاری پالیسیوں میں ”حدود“ قوانین اور انسداد توہین مذہب جیسے قوانین شامل ہیں۔ حدود قوانین میں مسلموں اور غیر مسلموں، دونوں پر بعض قرآنی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ انسداد توہین مذہب قوانین میں توہین اسلام یا توہین انبیاء پر سزائے موت مقرر ہے، جب کہ قرآن کی توہین پر عمر قید کی سزا اور کسی شہری کے مذہبی جذبات مجروح کرنے پر 10 سال قید کی سزا مقرر ہے۔ حدود قوانین اور انسداد توہین مذہب قوانین کا بعض اوقات غلط استعمال کیا جاتا ہے، اور انھیں ذاتی رنجشوں کا بدلہ لینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ صوبہ سرحد کی حکومت، اپنے حامیوں کے قدامت پسندانہ اسلامی تصور کے مطابق ہدایت نامے جاری کرتی رہی اور قانون بناتی رہی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے حسبہ بل مسترد کئے جانے اور وفاقی حکومت، اپوزیشن اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی طرف سے اظہار تشویش کے باوجود سرحد حکومت نے زیر نظر رپورٹ کے عرصہ کی تھوڑی مدت بعد بل کی منظوری دے دی۔ اس قانون پر عمل درآمد اس وقت معطل ہے، کیونکہ سپریم کورٹ میں اس کی آئینی حیثیت پر نظر ثانی کی جا رہی ہے۔

تاہم زیر نظر رپورٹ کے عرصہ کے دوران، حکومت مذہبی رواداری پر زور دیتی رہی، اور اس نے علمائے دین پر زور دیا کہ وہ فرقہ

(Posted on July 20, 2006)

وارانہ تشدد اور غیر مسلموں کو قتل کرنے کے خلاف فتویٰ جاری کریں۔ حکومت نے انسداد توہین مذہب قوانین پر بھی نظر ثانی کی تاکہ ان کا غلط استعمال روکا جا سکے۔ حکومت نے فرقہ پرست اور دہشت گرد تنظیموں پر پابندی جاری رکھی اور ان کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے مستعدی سے کوششیں کیں۔ اس کے علاوہ مذہبی عدم رواداری کی تعلیم کی روک تھام کے لئے نصاب تعلیم میں اصلاح کے لئے اقدامات کئے۔

مذہبی فرقوں کے درمیان تعلقات کشیدہ رہے۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف سماجی تعصب وسیع پیمانے پر دیکھنے میں آیا، اور ان اقلیتوں پر تشدد بھی ہوا۔ دہشت گرد اور انتہا پسند تنظیموں اور افراد سمیت متعصب عناصر نے مذہبی اجتماعات کو نشانہ بنایا۔ زیر نظر رپورٹ میں جس عرصہ کا احاطہ کیا گیا ہے، اس کے دوران فرقہ وارانہ تشدد سے 125 سے زیادہ اموات واقع ہوئیں۔ اس تشدد میں دہشت گرد تنظیم لشکر جھنگوی کے حملے شامل ہیں۔ تشدد کے واقعات میں سنی اور شیعہ دونوں فرقوں کے لوگوں کا بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہوا۔ متحدہ مجلس عمل (ایم ایم اے) نے، جو اسلامی سیاسی جماعتوں کا اتحاد ہے، سرکاری اور سماجی سطح پر نفاذ اسلام کے لئے سیاسی بیانات دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایم ایم اے قومی اسمبلی میں اپوزیشن کی قیادت کر رہی ہے۔ اسے صوبہ سرحد اسمبلی میں اکثریت حاصل ہے اور وہ بلوچستان میں مخلوط حکومت میں شامل ہے۔

تاہم ایم ایم اے کے بعض ممبروں نے عیسائیوں، سکھوں، ہندوؤں، بودھوں اور پارسیوں کے خلاف تعصب ختم کرنے کی کوششیں کیں اور سرکاری دباؤ کے تحت، اس کے کئی لیڈروں نے بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کی کوششوں میں حصہ لیا۔ ملک کی چھ بڑی شیعہ اور سنی تنظیموں کی نمائندگی کرنے والے مذہبی لیڈروں نے مئی میں ایک فتویٰ جاری کیا، جس میں فرقہ وارانہ تشدد اور غیر مسلموں کے قتل کی مذمت کی گئی۔ تمام مسلم مکاتب فکر کے علماء اور بعض مذہبی اقلیتوں نے ستمبر 2004 میں مل کر مذاہب کی عالمی کونسل بنائی۔ یہ ایک بین المذاہب تنظیم ہے، جو مکالمے اور رواداری کے فروغ کے لئے قائم کی گئی ہے۔ تاہم احمدیوں اور یہودیوں کے خلاف بیان بازی بلا روک ٹوک جاری رہی۔ متحدہ مجلس عمل کی مخلوط حکومت کے بعض حلقوں سے آغا خان کے پیروکاروں، اسماعیلیوں کے خلاف آواز بلند ہوتی رہی۔ حکومت، اسلامی مذہبی لیڈروں اور ایم ایم اے کے بعض لیڈروں کی اپیلوں کے باوجود فرقہ وارانہ تشدد اور تعصب کا سلسلہ جاری رہا۔

حکومت امریکہ، انسانی حقوق کے تحفظ کی اپنی مجموعی پالیسی کے تحت، حکومت پاکستان کے ساتھ مذہبی آزادی کے معاملات پر بات چیت کرتی رہی۔ زیر نظر عرصہ کے دوران، امریکی سفارت خانے کے حکام نے مذہبی اقلیتوں سے ہونے والے سلوک پر کڑی نظر رکھی اور اس سلوک میں بہتری لانے کے لئے متعدد اقدامات کئے۔ اصلاح تعلیم پروگرام کے تحت، امریکہ نے پاکستان کی وزارت تعلیم کی مدد جاری رکھی تاکہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی جا سکے اور مذہبی عدم رواداری کی تعلیم کو ختم کیا جا سکے۔ سفارت خانے کے حکام نے دینی مدارس کی اصلاح کے کام میں شامل تمام فریقوں سے بھی رابطہ رکھا تاکہ اصلاح کے عمل کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ سفارت خانے کے عہدیداروں نے ارکان پارلیمنٹ اور حکومت پر زور دیا کہ توہین مذہب قوانین اور حدود قوانین پر نظر ثانی کی جائے تاکہ ان قوانین کے غلط استعمال کو روکا جا سکے۔ ان عہدیداروں نے سرکاری حکام اور مذہبی لیڈروں کو آغا خانیوں کے خلاف بڑھتی ہوئی بیان بازی اور شمالی علاقوں میں فرقہ وارانہ تشدد پر بھی اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ سفارت خانے نے تمام مذہبی تنظیموں سے اپنے روابط میں اضافہ کیا اور میانہ روی کے فروغ، فرقہ وارانہ اور مذہبی بنیادوں پر ہونے والے تشدد کے خاتمے اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لئے اپنی حمایت کا اظہار کیا۔

سیکشن i . مذہبی تناسب

پاکستان کا رقبہ 310,527 مربع میل اور آبادی اندازاً 154 ملین ہے۔ مذہبی تناسب کے بارے میں 1998 کی مردم شماری کی بنیاد پر جو

(Posted on July 20, 2006)

اعداد و شمار دستیاب ہیں، ان کے مطابق 96 فیصد آبادی یا 148.8 ملین لوگ مسلمان ہیں۔ 2.02 فیصد یا 2.44 ملین لوگ ہندو ہیں۔ 1.69 فیصد یا 2.09 ملین آبادی عیسائی ہے اور 0.35 فیصد یا 539,000 لوگ احمدیوں سمیت دوسرے عقائد کے پیروکار ہیں۔

مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے۔ دس فیصد یا اندازاً 14.9 ملین لوگ شیعہ ہیں۔ شیعوں کا کہنا ہے کہ یہ تعداد صحیح نہیں ہے اور کم از کم 20 فیصد مسلم آبادی شیعہ ہے، جو قُم (اندازاً 40 فیصد) اور نجف (اندازاً 60 فیصد) مکتب فکر سے تعلق رکھتی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق شیعوں میں اندازاً 750,000 لوگ اسماعیلی ہیں، جن میں سے زیادہ تر آغا خان کے پیروکار ہیں۔ اندازاً 80,000 بوہرہ یا دوسرے چھوٹے مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیعہ پورے ملک میں موجود ہیں، تاہم ان کی زیادہ تعداد کراچی، گلگت اور بلوچستان کے بعض حصوں میں ہے۔ اسماعیلی زیادہ تر ہنزہ، کراچی اور بلتستان میں رہتے ہیں۔ سنی مسلم اکثریت تین بڑے مکاتب فکر (بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث) اور ایک سماجی سیاسی تحریک جماعت اسلامی پر مشتمل ہے۔ جماعت اسلامی کا اپنا مخصوص فلسفہ، مدارس اور مساجد ہیں۔ اہل حدیث کی تعداد زیادہ سے زیادہ 5 فیصد ہے۔ ان کی اکثریت پنجاب میں رہتی ہے۔ جماعت اسلامی کے حامیوں کے قابل اعتماد اعداد و شمار دستیاب نہیں، کیونکہ وہ کسی نہ کسی اور مکتب فکر سے تعلق رکھنے کے دعویدار ہیں۔ جماعت کے پیروکار زیادہ تر شہری علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ بریلوی اور دیوبندی، دونوں مکاتب فکر کے لیڈر دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پیروکاروں کی تعداد کُل مسلم آبادی کے 80 فیصد کے برابر ہے تاہم بیشتر غیر جانبدار مبصرین کا خیال ہے کہ بریلوی تعداد میں سب سے زیادہ ہیں، جو کُل مسلم آبادی کا تقریباً 60 فیصد ہیں، جبکہ دیوبندیوں کی تعداد تقریباً 20 فیصد ہے۔ البتہ ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ سندھ اور پنجاب میں بریلوی غالب اکثریت میں ہیں۔ دیوبندی زیادہ تر پشتون علاقے میں پائے جاتے ہیں، جن میں شمالی پنجاب سے لیکر صوبہ سرحد اور شمالی بلوچستان کے بعض علاقے شامل ہیں۔ تاہم کراچی اور پنجاب کے سرائیکی علاقے میں بھی ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

کئی چھوٹے گروپ بھی موجود ہیں، جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں۔ ان میں خاص طور ذکری فرقہ شامل ہے، جو گوادر، بلوچستان میں پایا جاتا ہے۔ ان کی تعداد اندازاً 200,000 ہے۔ بیشتر سنی مسلمان، ذکریوں کو ان کی مخصوص مذہبی رسوم کی وجہ سے، جن میں تربت، بلوچستان میں ان کا حج کرنا بھی شامل ہے، غیر مسلم قرار دیتے ہیں۔ احمدیوں کو بھی اس وجہ سے سرکاری طور پر غیر مسلم قرار دیا گیا ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کو آخری نبی نہیں مانتے۔ احمدیوں نے 1974 سے مردم شماری کا بائیکاٹ کر رکھا ہے، جس کی وجہ سے ان کے بارے میں درست اعداد و شمار دستیاب نہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کی تعداد کم از کم 2 ملین ہے۔ ان کی اکثریت ان کے روحانی مرکز چناب نگر، پنجاب میں رہتی ہے۔ (جسے وہ ربوہ کہتے ہیں)۔ 1998 میں پنجاب اسمبلی نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی تھی، جس میں احمدیوں کی مرضی کے خلاف ربوہ کا نام تبدیل کر کے چناب نگر رکھ دیا گیا تھا۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق غیر مسلموں کی تعداد کُل آبادی کا 4 فیصد ہے۔ تاہم ان کے لیڈروں کا دعویٰ ہے کہ درست تعداد اندازاً 10 فیصد ہے۔ عیسائی، جن کی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تعداد 1.69 فیصد یا 2.09 ملین ہے، دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری اصل تعداد 4 ملین ہے۔ ان میں سے 90 فیصد پنجاب میں رہتے ہیں۔ عیسائیوں کی سب سے بڑی مذہبی تنظیم پروٹسٹنٹ چرچ آف پاکستان ہے، جو کلیسائے انگلستان سے وابستہ ہے۔ عیسائیوں کا دوسرا بڑا گروپ کیتھولک فرقے پر مشتمل ہے، جبکہ باقی عیسائی مختلف پروٹسٹنٹ کلیساؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کراچی کے رومن کیتھولک لاٹ پادری کے حلقے کے اندازے کے مطابق کراچی میں 120,000، باقی سندھ میں 40,000 اور کوئٹہ، بلوچستان میں 5,000 کیتھولک عیسائی رہتے ہیں۔ اندرون سندھ میں نچلی ذات کے چند ہندو قبائل بھی عیسائی مذہب اختیار کر چکے ہیں۔

ہندوؤں کی سرکاری تعداد، کُل آبادی کا 2.02 فیصد یا 2.44 ملین ہے، تاہم ان کے لیڈروں کا دعویٰ ہے کہ ہماری اصل تعداد 4 ملین کے لگ

(Posted on July 20, 2006)

بھگ ہے۔ بیشتر ہندو سندھ میں رہتے ہیں، جہاں وہ آبادی کا 8 فیصد ہیں۔ پارسیوں، سکھوں اور بودھوں میں سے ہر ایک کی تعداد اندازاً 20,000 ہے، جبکہ بہائیوں کا دعویٰ ہے ہماری تعداد 30,000 ہے۔ پارسیوں کی مختصر مگر بااثر آبادی زیادہ تر کراچی میں رہتی ہے۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد کے بعض قبائل روائتی مظاہر پرست مذہب کے پیروکار ہیں۔

0.5 فیصد سے کم آبادی مذہب کے بارے میں خاموش ہے یا وہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کا کسی مذہب سے تعلق نہیں۔ سماجی دباؤ اتنا زیادہ ہے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا کہ اس کا کسی مذہب سے تعلق نہیں۔

مذہبی رسوم اور فرائض باقاعدگی سے ادا کرنے والوں کے اعداد وشمار دستیاب نہیں۔ روزمرہ زندگی میں مذہب کو اکثر اہم مقام حاصل ہوتا ہے۔ بیشتر مسلمان جمعے کی نماز پڑھتے ہیں، جو مسلمانوں کا مقدس دن ہے۔ بہت سے مسلمان روزانہ کی پانچ نمازوں میں سے کم از کم ایک نماز پڑھتے ہیں۔ ماہ رمضان میں وہ مسلمان بھی روزہ رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں، جو عام دنوں میں زیادہ مذہبی فرائض ادا نہیں کرتے۔

اندازاً 70 فیصد انگریزی بولنے والے رومن کیتھولک عیسائی باقاعدگی سے عبادت کرتے ہیں۔ اردو بولنے والے رومن کیتھولک عیسائی، جو باقاعدگی سے عبادت کرتے ہیں، انگریزی بولنے والوں سے کہیں کم ہیں۔

ہندومت کی کئی شکلیں ہیں۔ ہندو مندر اور ہندو مذہبی مقامات ملک بھر میں پائے جاتے ہیں۔ تاہم ان میں سے بیشتر اب رہائشگاہ کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ دیوالی اور ہولی جیسے مذہبی تہواروں میں حصہ لینے والوں کی تعداد عام مذہبی رسوم میں حصہ لینے والے ہندوؤں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

سکھ برادری پنجاب میں اپنے مقدس مقامات پر باقاعدگی سے اجتماعات منعقد کرتی رہتی ہے۔ سکھوں کے یاترا کے مشہور مقامات یہ ہیں: ننکانہ صاحب (جہاں سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک 1469 میں پیدا ہوئے تھے)، گوردوارہ حسن ابدال (جہاں بابا گرونانک کے ہاتھ کا نشان محفوظ ہے) اور ضلع نارروال میں کرتارپورہ (جسے ڈیرہ بابا نانک صاحب بھی کہتے ہیں، اور جہاں گرونانک دفن ہیں)۔

پارسی، جوزرتشت کے ماننے والے ہیں، کوئی باقاعدہ مذہبی اجتماعات منعقد نہیں کرتے، سوائے اگست کے 10 روزہ مذہبی تہوار کے، جسے نوروز (نیا دن) کہا جاتا ہے۔ تمام پارسیوں سے اس تہوار میں شرکت کی توقع کی جاتی ہے اور اطلاعات کے مطابق بیشتر اس میں شرکت کرتے ہیں۔ سال کے باقی دنوں میں، پارسی اپنے عبادت خانوں میں انفرادی طور پر عبادت کرتے ہیں۔

پاکستان میں غیر ملکی مشنری کام کر رہے ہیں۔ سب سے بڑا عیسائی مشن گروپ، چرچ آف پاکستان کے لئے بائبل کے ترجمے اور تشریح کے کام میں حصہ لیتا ہے۔ چرچ آف پاکستان کو انتظامی اور تعلیمی کام میں مدد دینے کے لئے کلیسائے انگلستان مشنری گروپ متعدد مشنری فراہم کر رہا ہے۔ رومن کیتھولک مشنری، جو زیادہ تر فرانسسکی ہیں، معذور افراد کی دیکھ بھال کا کام کرتے ہیں۔

سیکشن ii. مذہبی آزادی کی صورتحال

قانونی رپالیسی فریم ورک

آئین میں کہا گیا ہے کہ اس بات کے مناسب انتظامات کئے جائیں گے کہ اقلیتیں اپنے مذہبی شعائر آزادی سے ادا کرسکیں۔ تاہم عملاً حکومت نے مذہبی آزادی خصوصاً احمدیوں کی مذہبی آزادی پر کئی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ احمدیوں کے اس عقیدے کے پیش نظر کہ حضرت محمدؐ

(Posted on July 20, 2006)

آخری نبی نہیں، 1974 میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے انھیں غیر مسلم قرار دے دیا گیا تھا۔ بعد میں ضابطہ تعزیرات میں بھی کئی تبدیلیاں کی گئیں، جو احمدیوں کو مذہبی شعائر کی ادائیگی اور تبلیغ سے روکتی ہیں۔ تاہم حکومت نے ذکریوں اور آغا خانیوں کے خلاف اس طرح کی پابندیاں لگوانے کی تحریکوں کی مزاحمت کی ہے۔ دوسری مذہبی اقلیتیں اپنے مذہبی شعائر عموماً آزادی سے ادا کرتی ہیں، لیکن بعض مقامات پر مذہبی اقلیتوں پر یہ قانونی پابندی عائد ہے کہ بتوں وغیرہ کو سرعام نہ لایا جائے۔ امتیازی قوانین کی وجہ سے مذہبی اقلیتیں اکثر اپنے مذہب کا آزادانہ اظہار بھی نہیں کرتیں۔

آزادی تقریر پر "احترام اسلام" کی خاطر بعض معقول پابندیاں عائد ہیں۔ انسداد توہین مذہب قوانین کے تحت کسی ایسی بات یا عمل پر، جس سے اسلام یا انبیا کی توہین ہوتی ہو، سزائے موت مقرر ہے۔ اس کے علاوہ ایسا کوئی بھی قول وفعل، جس سے کسی کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہوں، ممنوع ہے اور اس پر سزائے قید دی جاسکتی ہے۔ ان قوانین پر شاذونادر ہی عمل کیا گیا۔ ایسا بہت کم ہوا کہ کسی مذہبی اقلیت کے جذبات مجروح کئے جانے کے بارے میں قوانین پر عمل کیا گیا ہو، یا اس بارے میں کوئی مقدمہ دائر کیا گیا ہو۔ سماجی، مذہبی یا سیاسی لیڈروں کے دباؤ کی وجہ سے عدالتیں اکثر مذہبی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے سے معذور رہیں۔ البتہ اگر سنی عقیدے کے خلاف اس طرح کا کوئی حقیقی یا مفروضے پر مبنی واقعہ ہوا تو عدالتوں نے مذکورہ دباؤ کی وجہ سے سخت کارروائی کی۔ مذہبی اقلیتوں سے تعصب برتنے کے واقعات کو بہت کم عدالتوں میں پیش کیا گیا۔ اس طرح کے مقدمات میں عدالتوں کا غیر جانبداری سے کارروائی کرنا ممکن نہیں۔ مقدمات کے فیصلے کا عمل بہت سست ہے۔ مقدمے کے اندراج اور پہلی پیشی کے درمیان عموماً ایک طویل وقفہ آتا ہے۔ ذیلی عدالتوں کو اکثر ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ یہ عدالتیں فیصلوں میں تاخیر کرتی ہیں اور انتہا پسند عناصر کی انتقامی کارروائی کے خطرے کے پیش نظر ضمانتیں منظور نہیں کرتیں۔ توہین رسالت مقدمات میں ابتدائی عدالتیں تقریباً ہمیشہ ضمانت نامنظور کردیتی ہیں اور اس کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ چونکہ ملزمان کو سزائے موت ہوسکتی ہے، اس لئے وہ ضمانت پر رہائی کے بعد فرار ہوسکتے ہیں۔ ملزمان، ضمانت کی نامنظوری کے خلاف اپیل کرسکتے ہیں (اور بہت سے یہ اپیل کرتے بھی ہیں)، لیکن ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ مقدمے سے پہلے شاذونادر ہی ان کی ضمانت منظور کرتی ہے۔ زیر نظر عرصہ کے دوران توہین مذہب کے 54 مقدمات درج ہوئے، جو گزشتہ عرصے کے مقابلے میں بقدر 11 زیادہ ہیں۔ انصاف وامن کے قومی کمیشن کے مرتب کردہ اعداد وشمار کے مطابق 1986 سے 2004 تک 634 افراد پر توہین مذہب کا الزام لگا۔ ان میں سے 309 مسلمان، 236 احمدی، 81 عیسائی اور 8 ہندو تھے۔

ملک کے ضابطہ تعزیرات میں بہت سے اسلامی قوانین (شرعی قوانین) کی شقیں شامل ہیں، جن کا اطلاق تمام افراد پر ہوتا ہے؛ اور جن میں کوئی مظلوم شخص کسی سے عملاً بدلہ لے سکتا ہے۔ عدالتی نظام متعدد قسم کی عدالتوں پر مشتمل ہے، جن کے اختیارات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض اوقات ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتے ہیں، جس سے دیوانی، فوجداری اور اسلامی نظام عدل میں اختلافات کا اظہار ہوتا ہے۔ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کا شریعت بنچ، ان مقدمات میں اپیلوں کی سماعت کرنے والی عدالت کے طور پر کام کرتا ہے، جن میں حدود قوانین کے تحت فوجداری عدالتوں میں سزا سنائی گئی ہو۔ شرعی عدالت اور شریعت بنچ کے ججوں اور وکلاء کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ وفاقی شرعی عدالت، کسی ایسے قانون کو بھی کالعدم قرار دے سکتی ہے، جو اس کی نظر میں اسلام کے احکامات کے منافی ہو۔ تاہم مارچ میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے مختاراں بی بی آبروریزی کیس میں حکم امتناعی جاری کیا اور فیصلہ دیا کہ وفاقی شرعی عدالت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ صوبائی ہائی کورٹ کے کسی فیصلے پر نظر ثانی کرے، خواہ شرعی عدالت کے پاس ابتدائی اپیل کی سماعت کا اختیار ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح شرعی اپیل بنچوں کے اختیارات کو دھچکا لگا۔ اندازاً 1,500 سے 2,000 افراد زیر نظر عرصہ کے دوران حدود قوانین کے تحت قید کئے گئے۔

(Posted on July 20, 2006)

آئین میں اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔ صدر اور وزیراعظم کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ تمام اعلیٰ حکام کو حلف اٹھانا ہوتا ہے کہ وہ ملک کے ''اسلامی نظریئے'' کی حفاظت کریں گے۔ مسجدوں کی تعمیر و مرمت اور علمائے دین کے لئے سرکاری فنڈز دیئے گئے۔ وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتیں، اقلیتوں کی ایسی مذہبی املاک کی دیکھ بھال کی قانونی طور پر ذمہ دار ہیں، جو تقسیم برصغیر کے وقت لاوارث ہوگئی تھیں۔ مذہبی اقلیتوں کا دعویٰ ہے کہ حکومت ان املاک کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے مناسب رقوم فراہم نہیں کرتی۔ حکومت نے سُنی مسلمانوں سے 2.5 فیصد ٹیکس وصول کیا، جو سُنی مساجد اور خیراتی اداروں میں تقسیم کیا گیا۔ دوسرے مذاہب کے لئے اس طرح کا کوئی انتظام نہیں۔

سُنی مسلمانوں سے بظاہر سرکاری ملازمتوں اور ترقیوں میں ترجیحی سلوک کیا گیا۔ بطور مسلمان سرکاری شناختی کارڈ حاصل کرنے کے خواہشمند لوگوں کو یہ بیان حلفی دینا ہوتا ہے کہ وہ ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی شرط ہے، جس کے ذریعے احمدیوں سے امتیاز برتا جاتا ہے۔ ووٹ کے اندراج کے لئے اس طرح کے بیان حلفی کی ضرورت نہیں، لیکن الیکشن کمیشن نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص بطور مسلمان ووٹرز لسٹ میں اپنا نام درج کرانا چاہتا ہو، اور اس کے مذہب پر عوام نے شک کا اظہار کیا ہو، تو اسے بیان حلفی دینا ہوگا۔ اسی وجہ سے احمدیوں نے انتخابات کا بائیکاٹ جاری رکھا ہوا ہے۔

متعدد مسلم مذہبی تعطیلات کو قومی تعطیلات کے طور پر منایا جاتا ہے، جن میں عید الفطر، عید الاضحیٰ، عاشورہ (نویں اور دسویں محرم) اور عید میلاد شامل ہے۔ ماہ رمضان کے دوران کاروباری اداروں کے اوقات کار مختصر کر دیئے جاتے ہیں۔ غیر اسلامی تعطیلات نہیں منائی جاتیں، البتہ کرسمس کے موقع پر محمد علی جناح کے یوم ولادت کے طور پر تعطیل منائی جاتی ہے۔

آئین میں ''مذہب کے حوالے سے تعلیمی اداروں کو تحفظ'' حاصل ہے۔ کسی طالب علم کو اپنے مذہب کی بجائے کسی اور مذہب کی تعلیم حاصل کرنے یا عبادت میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ کسی دوسرے مذہب یا فرقے کے طلباء کو ان کے مذہب کی تعلیم سے روکنے کی بھی ممانعت ہے۔

اسلامیات کا مضمون تمام سرکاری اسکولوں میں مسلم طلباء کے لئے ایک لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ غیر مسلم طلباء کے لئے قانون کے تحت اسلامیات کا مضمون پڑھنا لازمی نہیں، لیکن انھیں اپنے مذہب کا مضمون پڑھنے کی سہولت نہیں دی جاتی۔ بعض اسکولوں میں غیر مسلم طلباء ''اخلاقیات'' کا مضمون پڑھ سکتے ہیں؛ لیکن عملاً اساتذہ اکثر طلباء کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلامیات کا مضمون پڑھیں۔

آئین میں واضح طور پر لکھا ہے کہ کسی سرکاری تعلیمی ادارے میں داخلے کے وقت مذہب کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ سرکاری اہلکاروں کا کہنا ہے کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلے کے وقت صرف گریڈز اور ڈومیسائل کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ تاہم طلباء کو اپنی درخواست کے فارم پر اپنا مذہب بھی لکھنا ہوتا ہے۔ مسلم طلباء کو تحریری طور پر یہ بیان دینا ہوتا ہے کہ وہ ختم نبوت پر مکمل ایمان رکھتے ہیں۔ اس طرح احمدیوں سے امتیاز برتا جاتا ہے۔ غیر مسلم طلباء کو اپنے مقامی مذہبی پیشوا سے اپنے مذہب کا تصدیق نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔

والدین کو اپنے بچوں کو اپنے خرچ پر مذہبی اسکولوں میں بھیجنے کی آزادی ہے اور کئی والدین نے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں داخل کرایا۔

حکومت، اسلامی اسکولوں کو، جنھیں مدرسہ کہا جاتا ہے، ضوابط کا پابند بناتی ہے۔ 2002 کے مدرسہ رجسٹریشن آرڈی ننس کے تحت تمام مدارس کے لئے لازم ہے کہ وہ رجسٹریشن کرائیں، غیر ملکی امداد قبول نہ کریں اور غیر ملکی طلباء کو صرف ان کی حکومتوں کی منظوری سے داخلہ دیں۔ اندازاً 13,000 سے 15,000 مدارس میں سے چند سو مدارس ایسے ہیں، جنھوں نے پانچ مدرسہ بورڈز میں سے کسی بورڈ کے ہاں یا براہ

(Posted on July 20, 2006)

راست حکومت کے پاس اپنی رجسٹریشن نہیں کرائی۔ کسی غیر رجسٹرڈ مدرسہ کو بند نہیں کیا گیا۔ حکومت اور مدرسہ بورڈز نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ تمام مدارس میں مرحلہ وار جدید علوم متعارف کرائے جائیں گے، جن میں ریاضی، انگریزی اور سائنس شامل ہے۔ ان بورڈز نے اپنے ملحقہ مدارس پر لازم قرار دے رکھا ہے کہ وہ تمام شرائط پر تیزی سے عملدرآمد کریں۔ البتہ حکومت نے اس کام کے لئے فنڈز دینے کا جو وعدہ کیا تھا، اس پر عملدرآمد کی رفتار سست رہی ہے۔

صوبہ سرحد کی ایم ایم اے کی حکومت نے اپنے حامیوں کے قدامت پسندانہ مذہبی تصور کے مطابق ہدایات اور قوانین منظور کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اگر ان ہدایات اور قوانین پر عملدرآمد کیا گیا تو اس سے تمام شہریوں پر اسلامی قانون نافذ ہو جائے گا۔ موجودہ قوانین میں کئی اقدامات شامل ہیں، مثلاً انسداد فحاشی اقدامات۔ اس قانون کے تحت اشتہارات پھاڑ دیئے گئے اور ایسی دکانوں پر جرمانے کئے گئے، جہاں بعض مغربی ریکارڈنگ فروخت کی جاتی تھیں۔ شراب پر مکمل پابندی عائد ہے۔ سرکاری ملازمین پر لازم ہے کہ وہ نماز پنجگانہ ادا کریں۔ البتہ اس پابندی پر عملدرآمد نہیں کیا گیا۔ خواتین کی تصویروں اور ان کے سرعام رقص پر بھی پابندی ہے۔ اس پابندی پر بھی عملدرآمد نہیں کرایا گیا۔ شریعت بل، جو اس بل سے ملتا جلتا ہے، جو 1991 سے وفاقی سطح پر پیش ہو چکا ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ تمام قوانین کا، جن میں تعلیمی اور مالیاتی شعبے کے قوانین بھی شامل ہیں، شریعت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے ایم ایم اے کی طرف سے پیش کیے جانے والا احتساب بل مسترد کر دیا، جس میں ایک صوبائی ادارہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی، جسے اسلامی قوانین اور اسلامی اقدار کے نفاذ کا اختیار حاصل ہوتا۔

حکومت، روشن خیال اعتدال پسندی کے اپنے پروگرام کے تحت اعلیٰ ترین سطح پر، بین المذاہب مکالمے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر زور دیتی رہی۔ حکومت نے عالمی مذاہب کونسل کے افتتاحی اجلاس کا اہتمام کیا۔ یہ کونسل، علمائے دین اور مذہبی اسکالروں کا ایک ادارہ ہے، جو بین المذاہب مکالمے اور ہم آہنگی کے لئے کوشاں ہے۔ صدر نے ستمبر 2004 میں اس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا اور وزارت مذہبی امور اور صوبائی حکومتیں اس کونسل کی سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہیں۔ وزارت مذہبی امور اور اسلامی نظریاتی کونسل (جو ایک آئینی ادارہ ہے) بین المذاہب اور مختلف فرقوں کے مابین اجلاسوں اور مذاکروں کا اہتمام کرتی رہی۔ وزارت مذہبی امور نے فرقہ وارانہ تشدد اور غیر مسلموں کی ہلاکتوں کے خلاف احکامات کی تیاری میں سرگرم کردار ادا کیا، جو مئی 2005 میں نافذ کر دیئے گئے۔

مذہبی آزادی پر عائد پابندیاں

حکومت عملاً اور قانوناً احمدیوں کے مذہبی شعائر کی ادائیگی کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اور ان پر سخت پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ 1974 کی ایک آئینی ترمیم کے تحت احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ حضرت محمدؐ کو اسلام کا آخری نبی نہیں مانتے۔ آئینی پابندی کے باوجود احمدی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلامی شعائر پر عمل کرتے ہیں۔ 1984 میں حکومت نے ضابطہ تعزیرات میں سیکشن (298-c) کا اضافہ کیا، جسے عرف عام میں ''احمدی مخالف قانون'' کہا جاتا ہے۔ حکومت اور احمدی مخالف مذہبی تنظیمیں، اس قانون کو احمدیوں کو تنگ کرنے

(Posted on July 20, 2006)

کے لئے استعمال کرتی ہیں۔اس قانون میں احمدیوں پر پابندی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان نہ کہلوائیں، خود کو مسلمان ظاہر نہ کریں، اپنے عقیدے کو اسلام کا نام نہ دیں، اپنے عقیدے کی تبلیغ نہ کریں، کسی کو یہ عقیدہ قبول کرنے کی دعوت نہ دیں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح نہ کریں۔قانون میں جو مبہم زبان استعمال کی گئی ہے، اور جس میں احمدیوں کو ''بالواسطہ یا بلاواسطہ'' خود کو مسلمان ظاہر کرنے سے روکا گیا ہے، اس کی وجہ سے مسلم لیڈروں کو یہ موقع ملا کہ وہ ''السلام علیکم'' کہنے اور اپنے بچوں کے نام محمدؐ کے نام پر رکھنے پر احمدیوں کے خلاف مقدمات درج کرائیں۔سپریم کورٹ نے 1996 میں ایک کیس میں اپنے غیر متفقہ فیصلے میں سیکشن 298-c کی قانونی حیثیت کی توثیق کی۔اس قانون کی خلاف ورزی پر 3 سال تک قید اور جرمانے کی سزا ہو سکتی ہے۔احمدی برادری کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 2004 میں 51 احمدیوں پر اپنے عقیدے کی بنا پر یا مذہبی قوانین کی تحت فوجداری مقدمات درج کرائے گئے۔ان میں سے 4 پر توہین رسالت قوانین، 19 پر احمدیوں کے لئے خصوصی طور پر تیار کردہ قوانین کے تحت، ایک پر ایک مذہبی قانون کے تحت اور 27 پر دوسرے قوانین کے تحت لیکن دراصل احمدی عقیدے کی وجہ سے مقدمات درج کرائے گئے۔

حکومت نے ختم نبوت کی سالانہ کانفرنس کی اجازت دی اور اس طرح ملاؤں کی اس مہم کی خاموش توثیق کی، جو انھوں نے احمدیہ عقیدے کے ممکنہ خطرات کے خلاف چلا رکھی ہے۔احمدیوں کو سرعام کوئی کانفرنس یا اجتماع منعقد کرنے کی اجازت نہیں، اور 1983 سے انھیں اپنی سالانہ کانفرنس کی بھی اجازت نہیں دی جا رہی۔احمدیوں کو اپنے عقیدے کی تبلیغ کی بھی اجازت نہیں۔حکومت احمدیوں کو حج یا دوسرے مذہبی اجتماعات کے لئے سعودی عرب جانے کی اجازت نہیں دیتی۔جولائی 2003 سے یہ شرط عائد ہے کہ حج کے لئے جانے والے ہر شخص کو یہ بیان حلفی دینا ہوگا کہ وہ احمدیہ فرقے کے بانی کو نبوت کا جعلی دعویدار اور مکار شخص سمجھتا ہے۔اس طرح احمدیوں کو اسلام کے ایک رکن کی تعمیل سے روک دیا گیا ہے۔احمدیوں کے لٹریچر کی سرعام فروخت بھی ممنوع ہے۔تاہم احمدی، محدود سرکولیشن کے لئے اپنا مذہبی لٹریچر کافی مقدار میں شائع کرتے رہتے ہیں۔

آئین میں ''مذہبی اداروں کے انتظام کی آزادی'' کی ضمانت دی گئی ہے۔اصولی طور پر، حکومت، کسی مذہب کے پیروکاروں کو اپنی عبادت گاہ تعمیر کرنے اور اپنے مذہبی پیشواؤں کی تربیت کا انتظام کرنے سے نہیں روکتی۔تاہم عملاً احمدیوں کو اس حق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔
اخباری اطلاعات کے مطابق حکام نے احمدیوں اور ان کے اداروں کی جاسوسی جاری رکھی۔اطلاعات کے مطابق متعدد احمدی مسجدوں کو بند کر دیا گیا۔کئی مسجدوں کی توہین کی گئی یا مسجدوں کی تعمیر رکوا دی گئی۔مثال کے طور پر ضلع گوجرانوالہ کے قصبے تلے عالی میں مقامی حکومت نے اس وقت مسجد کی تعمیر رکوا دی، جب مسلمانوں نے وہاں حملے کئے۔حکومت، والدین کو اس بات پر کوئی سزا نہیں دیتی اور نہ کوئی پابندی عائد کرتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم اور پرورش اپنی مرضی کے مطابق کریں اور انھیں تربیت دلوائیں۔اسی طرح حکومت، والدین کو اس بات سے بھی منع نہیں کرتی کہ وہ بچوں کو گھر پر اپنے مذہب کی تعلیم دیں۔

آئین احترام اسلام کی خاطر آزادی تقریر پر معقول حد تک پابندیاں عائد کرتا ہے۔ضابطہ تعزیرات میں ایسی مخصوص دفعات موجود ہیں، جن میں کسی دوسرے مذہب کے خلاف کچھ کہنے یا عملی اقدامات کرنے پر پابندی عائد ہے۔ان دفعات کو اجتماعی طور پر
انسداد توہین رسالت قوانین کہا جاتا ہے۔ان میں اسلام یا انبیا کی توہین پر سزائے موت، توہین قرآن پر عمر قید اور کسی کے مذہبی جذبات مجروح کرنے پر 10 سال قید کی سزا مقرر ہے۔یہ قوانین اکثر آزاد خیال مسلمانوں، مخالف فرقے کے پیروکاروں اور مذہبی اقلیتوں کو تنگ کرنے کے لئے استعمال کئے گئے۔اس کے علاوہ ان قوانین کو ذاتی یا کاروباری رنجشوں پر انتقام لینے کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔اگرچہ ان قوانین کے تحت کسی ملزم کو سزا نہیں دی گئی، تاہم ملزمان کو برسوں جیل میں رہنا پڑا۔توہین رسالت کے ملزمان کو بہت کم ضمانت دی گئی اور اکثر عدالتوں نے انھیں

(Posted on July 20, 2006)

مجرم قرار دیا، کیونکہ ان عدالتوں کے ججوں کو انتہا پسندوں کی طرف سے دھمکیاں دی گئیں۔ بعض اوقات قیدیوں اور سیکورٹی فورسز نے بھی زیر حراست ملزمان کو قتل کیا، اور بعض صورتوں میں بری ہونے والے ملزمان کو لوگوں کے ہجوم نے مار ڈالا۔

بے بنیاد الزامات پر مقدمات کے اندراج کی روک تھام کے لئے حکومت نے جنوری 2005 میں ایک قانون نافذ کیا، جس میں کہا گیا ہے کہ کوئی مقدمہ درج کرنے سے پہلے اعلیٰ پولیس افسران توہین مذہب کے بارے میں الزامات کی چھان بین کریں گے۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں 2000 سے قانون میں اس طرح کی اصلاح کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ نئے قانون کے مثبت اثرات دیکھنے میں آئے۔ یکم جنوری اور 30 جون 2005 کے درمیان، توہین مذہب کے 17 مقدمات درج ہوئے، جبکہ 2004 کے آخری چھ ماہ میں اس طرح کے 37 مقدمات درج ہوئے تھے۔ 15 مسلمانوں کے خلاف، 21 احمدیوں کے خلاف اور ایک عیسائی کے خلاف۔ اور اکتوبر 2004 میں قومی اسمبلی میں نظر ثانی شدہ قانون کی منظوری کے بعد صرف 9 مقدمات درج ہوئے۔ تاہم زیر نظر رپورٹ کے عرصے میں توہین مذہب کے 54 مقدمات درج ہوئے، جو گزشتہ رپورٹ کے عرصے کے مقابلے میں گیارہ کی تعداد میں زیادہ ہیں۔ امن وانصاف کے قومی کمیشن کے مرتب کردہ اعداد و شمار کے مطابق 1986 اور 2004 کے درمیانی عرصہ میں 634 افراد پر توہین مذہب کا الزام لگایا گیا۔ ان میں سے 309 مسلمان، 236 احمدی، 81 عیسائی اور 8 ہندو تھے۔

تبدیلیِ مذہب کے خلاف کوئی قانون نہیں۔ تاہم اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرنے کے خلاف سماجی دباؤ اتنا زیادہ ہے کہ کوئی شخص خفیہ طور پر ہی مذہب تبدیل کر سکتا ہے۔

سِول میرج کا رواج نہیں۔ شادیاں مذہب کے مطابق ہوتی ہیں اور اسی کے مطابق ان کا اندراج ہوتا ہے۔ اگر کوئی ہندو یا عیسائی مَرد اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کی شادی قانونی طور پر برقرار رہتی ہے لیکن اگر کوئی ہندو یا عیسائی عورت یا کسی اور مذہب کی عورت اسلام قبول کر لیتی ہے تو اس کی سابقہ مذہبی رسومات کے مطابق ہونے والی شادی منسوخ تصور کی جاتی ہے۔ اگر کوئی ہندو یا عیسائی عورت اسلام قبول کرتی ہے لیکن اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار نہیں کرتی اور نہ ہی اس کا شوہر اسلام قبول کرتا ہے تو اس کے ہاں ہونے والی اولاد کو ناجائز تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی غیر مسلم مَرد، اسلام قبول کرتا ہے تو اس کے بچوں کو ناجائز اولاد تصور نہیں کیا جاتا۔ اسلامی قانون کے تحت مسلمان مرد اہل کتاب (یہودی یا عیسائی) عورت سے شادی کر سکتا ہے، لیکن ہندو عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔ مسلمان عورتیں صرف مسلمان مردوں سے شادی کر سکتی ہیں۔

قانون میں ایسا کوئی تقاضا شامل نہیں کہ کوئی شخص کسی خاص مذہب پر عمل کرے یا اس سے تعلق رکھے۔ اگر کوئی شخص کسی بھی مذہب سے وابستہ نہیں تو حکومت اسے کوئی سزا نہیں دیتی اور نہ ہی قانوناً اس سے کوئی امتیاز برتتی ہے۔ تاہم عملاً سماجی دباؤ اتنا زیادہ ہے کہ بہت کم لوگ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ ان کا کسی مذہب سے تعلق نہیں۔ اگر کوئی شخص مذہب سے لاتعلقی کا اعلان کرے گا تو اسے سخت امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حکمران جماعت یا اعتدال پسند اپوزیشن پارٹیوں کی رکنیت حاصل کرنے کے لئے کسی مذہب سے تعلق رکھنا ضروری نہیں۔ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والا شخص ان کا رکن بن سکتا ہے۔ ایم ایم اے سے تعلق رکھنے والے ایسے ارکان پارلیمنٹ بھی ہیں، جو غیر مسلم ہیں۔ تاہم عملاً ایم ایم اے میں شامل ہر جماعت، عموماً اپنے فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو رکنیت دیتی ہے۔ احمدیوں یا یہودیوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایم ایم اے یا اس کی کسی جماعت میں شامل ہوں۔ اسی طرح عملاً اسماعیلی یا ذکری، جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمٰن گروپ یا سمیع الحق گروپ یا جماعت اسلامی میں شامل نہیں ہو سکتے۔ شیعوں کا کہنا ہے کہ جماعت اسلامی میں ان کی شمولیت کا خیر مقدم نہیں کیا جاتا، تاہم جماعت اسلامی اس کی تردید کرتی ہے۔ فرقہ پرست انتہا پسند گروپ ''سُنی تحریک'' کی سیاسی شاخ صرف بریلویوں کو رکنیت دیتی

ہے۔

حکومت کسی خاص عقیدے، مذہب یا مذہبی نظریات کی مخصوص تشریح کی بنیاد پر سیاسی پارٹیاں قائم کرنے پر کوئی پابندی نہیں لگاتی۔ حکومت نے مختلف اسلامی پارٹیوں اور ان سے تعلق رکھنے والے بعض ایسے علماء کی سرگرمیوں پر نظر رکھی، جن کا ماضی میں دہشت گرد یا انتہا پسند تنظیموں سے تعلق تھا۔ دیوبندی اور اہل حدیث لیڈروں نے دعویٰ کیا کہ حکومت نے ان کے کارکنوں کو سیاسی نظریات کی بنا پر تنگ کیا۔ اسی طرح اہل حدیث اور بریلویوں نے دعویٰ کیا کہ حکومت نے سیاسی انتہا پسندوں کو مطمئن کرنے کے لئے سرکاری مسجدوں، سرکاری اسکولوں اور مذہبی فرائض سے تعلق رکھنے والی دوسری سرکاری ملازمتوں کے لئے جماعت اسلامی اور دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والوں سے ترجیحی سلوک کیا۔ حکومت نے ان الزامات کی تردید کی۔

مشنریوں کو ملک میں کام کرنے کی اجازت ہے اور احمدیوں کے سوا باقی سب کو تبلیغ کی بھی اجازت ہے، بشرطیکہ اسلام کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے اور مشنری اس بات کا اعتراف کریں کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ البتہ تمام مشنریوں کو خصوصی ویزا لینا پڑتا ہے، جو 2 سے 5 سال کے لئے کارآمد ہوتا ہے، اور انھیں سال میں ایک مرتبہ پاکستان میں داخلے کی اجازت ہوتی ہے۔ زیر نظر عرصہ کے دوران مشنریوں کے لئے صرف ''متبادل ویزا'' دستیاب تھا، جو کسی مشنری کی ملک سے روانگی کی صورت میں متبادل مشنری کے لئے درکار ہوتا ہے۔ ویزا کے حصول کے لئے لمبا انتظار اور ضابطے کی کارروائی کے مسائل اکثر دیکھنے میں آئے۔

انسداد دہشت گردی قانون کے تحت کسی بھی ایسی کارروائی پر، بشمول تقریر کے، جس کا مقصد مذہبی منافرت پھیلانا ہو، 7 سال قید با مشقت کی سزا ہو سکتی ہے۔ اس قانون کے تحت اگر جج کے پاس معقول وجوہات موجود ہوں کہ ملزم واقعی مجرم ہے تو وہ اس کی ضمانت منظور نہیں کرتا۔ تاہم اس قانون کے اطلاق میں جانبداری سے کام لیا جاتا ہے۔

حکومت عام طور پر مذہبی لٹریچر کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں لگاتی۔ تاہم احمدیوں کا مذہبی لٹریچر ممنوع ہے۔ اسلام یا انبیا پر تنقید یا کسی بھی دوسرے مذہب کی توہین پر پابندی عائد ہے۔ اقلیتوں کے مذہب کی توہین کرنے پر شاذ و نادر ہی کوئی کارروائی کی گئی۔ مثال کے طور پر ایک ممنوعہ دہشت گرد تنظیم لشکر طیبہ کے لیڈر امیر حمزہ نے ہندومت کے بارے میں 1999 میں ''ہندو کی حقیقت'' نامی ایک انتہائی اہانت آمیز کتاب لکھی، لیکن اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی گئی۔ عیسائی مقدس کتابیں اور لٹریچر آسانی سے دستیاب ہے۔ لیکن عیسائیوں نے بتایا کہ انھیں دباؤ کا خدشہ رہتا ہے جس کی وجہ سے انھیں خود ہی سنسر شپ پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ احمدیوں کا کہنا ہے کہ ان کے پریس کو پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جولائی 2003 میں تنویر احمد آصف اور عبدالقادر پر توہین مذہب اور احمدی مخالف قانون کی خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا، کیونکہ انھوں نے Religious Dalits of Pakistan نامی ایک کتاب لکھی تھی، جس میں ملک بھر میں احمدیوں کی حالت زار پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

قرآن کی اشاعت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا اصل عربی متن بھی شائع کیا جائے۔ مئی 2005 میں حکومت نے قرآن کے اردو ترجمے پر مشتمل کتاب ضبط کر لی، جو کینیڈا میں شائع ہوئی تھی، کیونکہ اس میں اصل عربی متن شامل نہیں تھا۔ نومبر 2004 میں پشاور ہائی کورٹ نے فرنٹیر پوسٹ کے سابق کاپی ایڈیٹر منور محسن کی توہین رسالت کے الزام میں دی جانے والی سزا کو کالعدم قرار دے دیا۔ محسن نے 2001 میں ایڈیٹر کے نام موصول ہونے والا ایک خط فرنٹیر پوسٹ میں شائع کر دیا تھا، جس میں حضرت محمدؐ پر تنقید کی گئی تھی۔ غیر ملکی کتابوں کی دوبارہ اشاعت سے پہلے ضروری ہے کہ حکومت سے اجازت لی جائے۔ کتابوں اور رسائل کی آزادانہ درآمد کی اجازت ہے لیکن انھیں یہ دیکھنے کے لئے سنسر کیا جاتا ہے کہ کہیں ان میں قابل اعتراض جنسی یا مذہبی مواد تو شامل نہیں۔ اسلام آباد کے ایک مجسٹریٹ نے نیوز ویک کے 22 نومبر 2004 کے شمارے

(Posted on July 20, 2006)

کوتلف کرنے کا حکم دیا کیونکہ اس میں ہالینڈ کے شہری Theo Van Gogh کے قتل کے بارے میں مضمون کے ساتھ قابل اعتراض تصاویر شامل تھیں، جن سے مبینہ طور پر قرآن پاک کی توہین ہوتی تھی۔

مقامی اور ضلعی حکومتوں نے تثلیث اور حضرت عیسیٰؑ کی تصاویر سمیت بعض مذہبی تصاویر کی اشاعت اور نمائش پر پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ تاہم ملک کے بعض حصوں میں اس طرح کی تصاویر بآسانی دستیاب تھیں۔

حکومت نے حج پر جانے والوں کے لئے سفر کی سہولیات اور فنڈز فراہم کئے، لیکن مذہبی اقلیتوں کے لئے اس طرح کا کوئی انتظام نہیں کیا جاتا۔ احمدیوں کے سفر حج پر پابندی کے علاوہ عملاً بہائیوں کو بھی اسرائیل میں اپنے روحانی مرکز پر جانے سے روکا گیا، کیونکہ پاکستان اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتا۔

حکومت نے پاسپورٹ اور شناختی دستاویزات پر مذہب کا خانہ بھی رکھا ہوا ہے۔ نومبر 2004 میں حکومت نے نئے مشین ریڈ ایبل پاسپورٹوں کا اجرا شروع کیا، جن میں مذہب کا خانہ نہیں تھا، لیکن قدامت پسندوں اور اسلامی پارٹیوں کے احتجاج پر حکومت نے اپنا فیصلہ تبدیل کرتے ہوئے مارچ 2005 میں مذہب کا خانہ بحال کر دیا۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ اس قسم کی دستاویزات میں انھیں مسلم لکھا جائے، انھیں یہ بیان حلفی دینا ہوتا ہے کہ ہم ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اور احمدیہ تحریک کے بانی کو جھوٹا نبی اور اس کے پیروکاروں کو غیر مسلم سمجھتے ہیں۔

لوگوں کو دوسرے ممالک میں اپنے ہم مذہبوں سے روابط رکھنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اس سلسلے میں رومن کیتھولک چرچ اور چرچ آف پاکستان نے کسی قسم کی رکاوٹ کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ اسماعیلیوں نے اپنے ہیڈ کوارٹرز سے باقاعدگی سے رابطہ رکھا۔ ان کے عہدیدار بشمول پرنس کریم آغا خان، پاکستان آتے رہے۔ ویزا کے دوطرفہ انتظامات کے تحت بھارتی ہندو اور سکھ لیڈر اور گروپ بھی پاکستان آتے رہے۔

آئین میں کہا گیا ہے کہ ملک کے صدر اور وزیراعظم کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ ارکان پارلیمنٹ سمیت حکومت کے تمام اعلیٰ عہدیداروں کو یہ حلف اٹھانا ہوتا ہے کہ ہم ملک کے اسلامی تشخص کی حفاظت کریں گے۔ سرکاری ملازمین کو اپنے عقیدے کے اظہار یا اس پر عمل کرنے کی کوئی ممانعت نہیں۔ صوبہ سرحد میں صوبائی احکامات میں کہا گیا کہ تمام سرکاری ملازمین نماز پنجگانہ ادا کریں۔ تاہم اس پر سختی سے عمل نہیں کرایا گیا۔ سرکاری ملازمتوں اور ترقیوں میں سُنی مسلمانوں سے بظاہر ترجیحی سلوک کیا گیا۔

شیعوں سمیت مذہبی اقلیتوں نے بتایا کہ حکومت نے سرکاری ملازمت دیتے وقت اور اعلیٰ تعلیمی اداروں سمیت سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلے کے وقت ان کے خلاف مسلسل تعصب برتا۔ سول سروس میں تمام اقلیتی گروپوں کی ترقی کو بظاہر محدود کیا گیا۔ احمدیوں کو اس سلسلے میں خاص طور پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جن کا کہنا ہے کہ انھیں ''غیر مرئی'' رکاوٹوں کے باعث اعلیٰ عہدوں پر ترقی نہیں دی جاتی اور بعض سرکاری محکموں میں انھیں ملازمت دینے یا اہل اور تربیت یافتہ احمدیوں کو ملازمت میں برقرار رکھنے سے انکار کیا۔ بطور مسلم، سرکاری شناختی دستاویزات حاصل کرنے کے خواہشمند تمام لوگوں کو بیان حلفی دینا ہوتا ہے کہ ہم ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ شرط خاص طور پر احمدیوں سے امتیاز برتنے کے لئے عائد ہے۔ مذہبی اقلیتوں نے بتایا کہ حکومت نے ان کے علاقوں میں برابر کی شہری سہولتیں نہیں دیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وزارت مذہبی امور نے ان کے سماجی اور اقتصادی حالات بہتر بنانے کے لئے مناسب اقدامات نہیں کئے۔ وزارت نے ان الزامات کو مسترد کر دیا اور کہا کہ اس نے اپنا 30 فیصد سالانہ بجٹ اقلیتوں پر خرچ کیا۔ اہل حدیث اور بریلوی لیڈروں نے بتایا کہ سرکاری مسجدوں کے اماموں اور سرکاری کالجوں میں اسلامیات پڑھانے والے اساتذہ میں ان کے مسلک کے لوگوں کو مناسب نمائندگی حاصل نہیں۔ انھوں نے کہا کہ وزارت مذہبی امور اور وزارت تعلیم کے اسلامیات ونگ پر جماعت اسلامی کے کارکن چھائے ہوئے ہیں۔ اہل حدیث نے شکایت کی کہ

(Posted on July 20, 2006)

زکوٰۃ اور عشر کونسل جیسے سرکاری مذہبی اداروں میں انھیں مناسب نمائندگی حاصل نہیں۔

احمدیوں کی طرف سے مسلسل یہ شکایت ملتی رہی کہ انھیں ووٹنگ کے حق سے محروم رکھا جا رہا ہے کیونکہ ان پر پابندی عائد ہے کہ بطور غیر مسلم اپنے ووٹ کا اندراج کرائیں۔ عوام میں سے کوئی بھی شخص مسلم ووٹرز لسٹ میں شامل کسی شخص کے عقیدے کو ختم نبوت اور احمدیت کے حوالے سے چیلنج کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے احمدی، ووٹرز لسٹ میں اپنا نام درج نہیں کراتے۔ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کے لئے نشستیں مخصوص ہیں۔ یہ نشستیں سیاسی پارٹیوں کو ان کی اسمبلی میں کُل نشستوں کے تناسب سے دی جاتی ہیں۔

مذہبی اقلیتوں کے ارکان نے معمولی تعداد میں فوج میں ملازمت اختیار کی۔ ان کی ترقی کی راہ میں کوئی سرکاری رکاوٹ نہیں ہے۔ تاہم عملاً شاید ہی کوئی ایسا غیر مسلم ہو، جو کرنل کے عہدے سے آگے گیا ہو۔ انھیں سیاسی طور پر حساس عہدہ بھی نہیں دیا جاتا۔ مسلمان فوجیوں کے لئے مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لئے علما کا انتظام کیا گیا، لیکن مذہبی اقلیتوں کے لئے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔

پبلک اسکولوں کے نصاب تعلیم کو 1980 کے عشرے میں اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کیا گیا۔ اس نصاب میں ایسی کتابیں بھی شامل کی گئیں، جن میں مذہبی اقلیتوں خصوصاً ہندوؤں اور یہودیوں کے خلاف مواد موجود تھا۔ مذہبی عدم رواداری کی عمومی تعلیم کو بھی قابل قبول قرار دیا گیا۔ عدم رواداری کی تعلیم کے خاتمے اور سیکولر مضامین کو اسلامی تعلیم سے الگ کرنے کے لئے نصاب تعلیم پر بڑے پیمانے پر نظر ثانی کی گئی۔ وزارت تعلیم نے اس کام کے لئے، جو کئی سالہ منصوبہ ہے، بین الاقوامی امدادی اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ تعاون کیا، اور اس عزم کا اظہار کیا کہ قدامت پسند مذہبی عناصر کی مخالفت کے باوجود یہ سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔ طلباء کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل رہی۔ کئی احمدیوں اور عیسائیوں نے بتایا کہ انھیں سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلے کے وقت مذہبی بنیاد پر تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔ بتایا گیا ہے کہ عیسائیوں اور احمدیوں کو میڈیکل کالجوں میں داخلہ دینے سے انکار کیا گیا۔ بہت سی یونیورسٹیوں میں بھی احمدیوں کے خلاف سماجی تعصب دیکھنے میں آیا۔

حکومت نے 1972 میں پنجاب اور سندھ میں تمام چرچ اسکول اور کالج قومی ملکیت میں لے لئے تھے۔ حکومت سندھ نے 1985 سے 1995 تک ان اداروں کو بتدریج قومی ملکیت سے نکالنے کے پروگرام پر عمل کیا۔ حکومت پنجاب نے بھی 1996 میں اسی طرح کا پروگرام شروع کیا۔ 2001 میں وفاقی حکومت اور عدالتوں نے صوبائی حکومتوں کو حکم دیا کہ ان اداروں کو قومی تحویل سے پوری طرح نکالنے کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ اس پر اساتذہ کی تنظیموں نے احتجاج کیا، کیونکہ انھیں اپنی ملازمت خطرے میں نظر آئی۔ انھوں نے اس پروگرام کو عدالت میں بھی چیلنج کیا۔ 2003 میں فورمین کرسچین کالج کو قومی تحویل سے نکالنے سے، (جو ملک میں عیسائیوں کا قائم کردہ ممتاز ترین تعلیمی ادارہ ہے)، اور دسمبر 2003 میں اسے اصل مالکان پریسبیٹیرین چرچ، یو ایس اے (PCUSA) کے حوالے کرنے سے، قانونی رکاوٹیں دور کرنے میں مدد ملی۔ مئی میں حکومت سندھ نے اعلان کیا کہ وہ سینٹ پیٹرک اور سینٹ جوزف کالج، کیتھولک تعلیمی بورڈ کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ PCUSA کے دو اداروں گورڈن کالج، راولپنڈی اور مرے کالج، سیالکوٹ کے معاملات حل طلب رہے۔

سرکاری پالیسیوں میں مذہبی اکثریت اور اقلیت کو برابر کا تحفظ حاصل نہیں۔ وزارت مذہبی امور کے مجلّے پر، جو مذہبی آزادی کے تحفظ کی ذمہ دار ہے، یہ قرآنی آیت تحریر ہے: ''اللہ کا پسندیدہ دین صرف دین اسلام ہے۔'' وزارت کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنا تیس فیصد بجٹ نادار اقلیتوں کی فلاح و بہبود، اقلیتوں کی عبادت گاہوں کی دیکھ بھال، اقلیتوں کی چھوٹی ترقیاتی اسکیموں اور اقلیتوں کے تہواروں پر خرچ کرتی ہے۔ تاہم مذہبی اقلیتیں ان اعداد و شمار کو درست تسلیم نہیں کرتیں اور کہتی ہیں کہ اقلیتوں کی بستیوں اور دیہات میں بنیادی سہولیات دستیاب نہیں۔

تمام مذہبی گروپوں کو، جنھوں نے عبادت گاہ تعمیر کرنے یا اس کے لئے زمین حاصل کرنے کی کوشش کی، دفتری تاخیر کا سامنا کرنا پڑا

(Posted on July 20, 2006)

اوران سے رشوت بھی طلب کی گئی۔ اسی طرح کے مسائل کا سامنا غیر مذہبی گروپوں کو بھی کرنا پڑا۔ احمدیوں کو عبادت گاہیں تعمیر کرنے سے روکا گیا۔ مثال کے طور پر ضلع گوجرانوالہ کے قصبے تتلے عالی میں احمدیوں کو اس وقت عبادت گاہ تعمیر کرنے سے روک دیا گیا، جب مقامی مسلمانوں نے وہاں حملے کیئے۔ سُنی مسلم گروپوں نے سرکاری اجازت کے بغیر مسجدیں اور مزار تعمیر کیئے اور اس سلسلے میں بعض اوقات قوانین کی خلاف ورزی بھی کی۔

وفاقی اور صوبائی حکومتیں، ایسی مذہبی املاک کی دیکھ بھال کی قانونی طور پر ذمہ دار ہیں، جو برصغیر کی تقسیم کے وقت لاوارث ہوگئیں تھیں۔ ان املاک کی ملکیت اور دیکھ بھال پر مذہبی اقلیتوں سے پیدا ہونے والے تنازعات پر دیوانی عدالتیں نظر ثانی کر سکتی ہیں۔ حکومت نے بعض املاک کی دیکھ بھال اور مرمت کے لئے فنڈ ز دیئے تاہم اقلیتی برادریوں کا کہنا تھا کہ حکومت اس کام پر مناسب توجہ نہیں دیتی۔

فوجداری قانون، اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ مجرم، مدعی کو ہرجانہ ادا کرسکتا ہے۔ اسی طرح مدعی کو عدالتوں کے ذریعے مجرم کو سزا دلوانے کی بجائے قصاص کا حق حاصل ہے۔ یہ مبینہ طور پر ایک اسلامی قانون ہے، جس کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔ اقلیتوں نے بتایا کہ اقلیت سے تعلق رکھنے والے مجرموں کو مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مالی معاوضہ دینا پڑا اور مدعی کی صورت میں انھیں بہت کم مالی معاوضہ دیا گیا۔

ایک اور قانون، جس کے بارے میں ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ یہ اسلامی ہے یا نہیں، حدود آرڈیننسوں کا قانون ہے۔ اس قانون میں آبروریزی، ماورائے شادی جنسی تعلق، جائداد کے متعلق جرائم، شراب اور جوئے پر سزائیں مقرر ہیں۔ اس قانون کا اطلاق مسلموں اور غیر مسلموں سب پر برابر ہوتا ہے۔ حدود کے جرائم پر قرآنی یا سیکولر شہادت کے تحت عدالتی کارروائی ہوتی ہے۔ اگر قرآنی شہادت استعمال کی جارہی ہو تو مسلم اور غیر مسلم، اور مَرد اور عورت کی شہادت کی اہمیت میں فرق ہوگا، اور جرم ثابت ہونے پر سخت قرآنی سزا دی جاسکتی ہے۔ اس معیار شہادت پر کوئی کیس پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ سیکولر شہادت کی بنیاد پر مقدمات کی کامیابی سے سماعت ہوئی ہے۔ اس میں تمام گواہوں کی شہادت کو برابر کی اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے تحت قید اور جرمانے کی سزائیں دی گئیں۔ حدود قانون کے تحت عورتوں پر ماورائے شادی جنسی تعلقات کے جھوٹے مقدمات بھی دائر کیئے گئے، اور انھیں مقدمے کی کارروائی شروع ہونے تک طویل عرصے تک حراست میں رہنا پڑا۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لئے حکومت نے جنوری 2005 میں نیا قانون منظور کیا، جس میں یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ حدود الزامات میں کسی عورت کی حراست سے پہلے عدالتی حکم حاصل کیا جائے۔ انسانی حقوق کے کارکنوں کا کہنا ہے کہ قانون میں یہ ترمیم کافی نہیں۔ انھوں نے حدود قوانین کی منسوخی کی تحریک جاری رکھی۔

مذہبی آزادی کی خلاف ورزیاں

زیرحراست لوگوں پر پولیس تشدد اوران سے ناروا سلوک، ملک بھر میں ایک عام مسئلے کی صورت میں موجود رہا اور بعض اوقات اس تشدد کی وجہ سے ماورائے عدالت اموات بھی واقع ہوئیں۔ اس بات کا تعین کرنا مشکل ہے کہ اس طرح کے واقعات میں مذہبی تعصب بھی شامل تھا یا نہیں۔ تاہم احمدیوں اور عیسائیوں دونوں نے بتایا کہ اس بات کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے کہ ان کے ارکان کے خلاف زیادتی کی جائے گی۔ اقلیتوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ ان کے خلاف جرائم میں ملوث ملزموں کے خلاف پولیس نے اکثر مناسب کارروائی نہیں کی اور انھیں گرفتار نہیں کیا۔ دولتمند اور بااثر قیدیوں کے قید خانوں کے سوا باقی قید خانوں کے حالات انتہائی خراب پائے گئے۔ غیر مسلم قیدیوں کو عموماً مسلم قیدیوں

سے بھی زیادہ خراب حالات میں رکھا گیا۔

سیموئیل مسیح نامی ایک عیسائی، جس پر توہین مذہب کا الزام تھا اور جو پولیس تشدد کے نتیجے میں مئی 2004 میں ہلاک ہو گیا تھا، اس کے قتل میں ملوث پولیس اہلکار حراست میں رہا۔ اس کے مقدمے کی کارروائی مکمل نہیں ہوئی۔

26 جولائی 2004 کو پولیس نے ایک ہندو کھیت مزدور مانو کوہلی کو ضلع دادو میں غیر قانونی طور پر حراست میں لے لیا، اسے بُری طرح مارا پیٹا اور اذیتیں دیں۔ بعد میں اسے چھوڑ دیا گیا۔ اس واقعہ میں ملوث دو افسروں پر فرد جرم عائد کی گئی۔

19 اگست 2004 کو ناصر مختار نامی ایک عیسائی شیخوپورہ میں پولیس تشدد سے ہلاک ہو گیا۔ مختار کو 16 اگست کو چوری کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کے والد نے بتایا کہ مختار کی مسلمان لڑکوں سے دوستی تھی، جو اسے اپنے گھر لے گئے اور پھر اسے چوری کے الزام میں پھنسا دیا۔ تفتیش کے دوران پولیس نے مختار کو بُری طرح مارا پیٹا اور پھر سول ہسپتال میں داخل کرا دیا، جہاں وہ انتقال کر گیا۔ جب مقامی عیسائیوں نے اس واقعہ پر احتجاج کیا تو پولیس نے انھیں منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس پھینکی۔ پولیس نے احتجاج کے دوران جرائم کا ارتکاب کرنے پر 20 عیسائیوں پر فرد جرم عائد کی۔ مختار کے قتل میں ملوث افسروں پر فرد جرم عائد کی گئی لیکن کسی کو گرفتار نہیں کیا گیا۔

3 نومبر 2004 کو نامعلوم افراد نے ایک آٹھ سالہ عیسائی لڑکے سیموئیل سیٹھی کو اغوا کر لیا۔ اس کے گھر والوں نے اغوا کاروں کو تاوان ادا کیا لیکن پھر بھی اغوا کاروں نے اسے قتل کر دیا۔ پولیس نے سیٹھی کی لاش برآمد کی اور مقدمہ درج کر لیا۔ تاہم ہمسایوں نے جن افراد پر قتل کا شبہ ظاہر کیا، پولیس نے انھیں گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔ سیٹھی کے خاندان والوں نے الزام لگایا کہ ملزموں نے پولیس کو رشوت دی تھی۔ انصاف کی کئی اپیلوں کے بے سود ثابت ہونے کے بعد سیٹھی خاندان ملک سے باہر چلا گیا۔

8 فروری 2005 کو علی پور چٹھہ میں تین مسلمان مَردوں نے ایک 13 سالہ عیسائی لڑکی فوزیہ ظفر کو اغوا کر لیا۔ عینی شاہدوں کے بیانات اور اغوا میں ملوث دو ملزموں کے اقبالی بیانات کے باوجود، پولیس نے مقدمہ درج کرنے سے انکار کر دیا۔ فوزیہ کا والد ظفر مسیح اپنی شکائت لے کر ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر کے پاس گیا، جس نے مقامی پولیس افسروں کو مجبور کیا کہ وہ مقدمہ درج کریں اور دو مشتبہ افراد کو حراست میں لے لیں۔ اس مقدمے کے بعد ظفر مسیح کو مقامی سرکاری نوکری سے نکال دیا گیا اور مقامی مسلمانوں نے اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ مقدمہ واپس لے لے۔ فوزیہ کو اغوا کرنے والا تیسرا ملزم فوزیہ سمیت روپوش ہے۔

مذہب کی بنیاد پر کسی شخص کے لاپتہ ہونے کے کسی واقعے سے حکومت کا کوئی تعلق ثابت نہیں ہوا۔

ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ سیکورٹی فورسز مذہب کی بنیاد پر کسی کی آبرو ریزی کرنے یا اسے معذور کرنے میں ملوث پائی گئیں ہوں

انسداد توہین مذہب قوانین کو اکثر مذہبی اقلیتوں اور آزاد خیال مسلمانوں کو تنگ کرنے اور ذاتی اور کاروباری رنجشوں کا بدلہ لینے کے لئے استعمال کیا گیا۔ کئی افراد کو جھوٹے مقدمات میں گرفتار کیا گیا اور انھیں سزا دی گئی۔ انھیں کئی سال جیل کاٹنی پڑی اور بعد میں کہیں اپیل پر رہائی ملی۔ گزشتہ رپورٹوں کے برعکس زیرنظر رپورٹ کے عرصہ میں توہین مذہب میں ملوث نظر بندوں کی پولیس یا قیدیوں کے ہاتھوں ہلاکت کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ تاہم بعض اوقات ایسا ہوا کہ لوگوں کے ہجوم نے کسی ملزم پر گرفتاری سے پہلے ہی حملہ کر دیا اور اسے مار ڈالا۔ مذہبی انتہا پسندوں نے توہین مذہب کیسوں میں بَری ہونے والوں کو قتل کرنے کی دھمکیاں دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ کئی مشہور مقدمات کے ملزمان اکثر رہا ہونے کے بعد روپوش ہو گئے یا ملک سے باہر چلے گئے۔ جنوری 2005 میں مذہبی آزادی کی خلاف ورزیاں روکنے کے لئے نیا قانون نافذ کیا گیا، جس کے تحت ضروری ہے کہ توہین مذہب کا کوئی بھی مقدمہ درج کرنے سے پہلے سینئر پولیس افسران تمام الزامات کی چھان بین کریں۔ زیرنظر رپورٹ کے

(Posted on July 20, 2006)

عرصہ کے اختتام پر22 ملزمان، توہین مذہب کے الزام میں زیرحراست تھے اور مقدمہ چلنے کا انتظار کر رہے تھے، جبکہ 9 سزا سنائے جانے کے بعد قید کاٹ رہے تھے۔

زیرنظر رپورٹ کے عرصہ کے اختتام تک ممنوعہ انتہاپسند مسلم تنظیم سپاہ صحابہ کے کارکن طارق بٹ کا مقدمہ اور ایک اور قیدی کا مقدمہ، جس نے 2002 میں توہین مذہب کے ملزم صوفی مسلم کو قتل کیا تھا، زیرالتوا تھا۔

زیرنظر عرصہ کے دوران پرویز مسیح اور رانجھا مسیح کے مقدمات میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی، جو توہین مذہب کے الزامات میں قید تھے۔

27 جولائی 2004 کو واہ کنیٹ میں ایک مسلم خاتون نے 16 سالہ عیسائی لڑکی سلف تسنیم دین پر سرعام الزام لگایا کہ اس نے قرآن کا نسخہ کوڑے کے ڈھیر میں پھینکا ہے۔ دراصل تسنیم کی 11 سالہ بہن نے غلطی سے اپنے والد کا قرآن کا ایک نادر نسخہ کوڑے میں پھینک دیا تھا۔ جس مسلم خاتون نے تسنیم پر الزام لگایا، اس کے تسنیم کے خاندان سے تعلقات کشیدہ چلے آرہے تھے۔ قرآن کی بے حرمتی کے الزام کے بعد بہت سے مسلمان جمع ہوگئے اور انھوں نے دین فیملی کے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دی اور تسنیم کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ مقامی عمائدین اور پولیس نے مداخلت کی اور لڑکی اور اس کے والد کو گرفتار کرلیا گیا۔ پولیس نے بعد میں مقامی مسلمان اور عیسائی لیڈروں کے درمیان مذاکرات کے بعد تسنیم اور اس کے والد کو رہا کردیا۔ تاہم دین فیملی نے اپنی حفاظت کی خاطر اپنی رہائش گاہ بدل لی۔

اکتوبر 2004 میں پولیس نے یرموک پیپر مِل کے مالک محمد علی پر توہین مذہب کی فرد جرم عائد کی۔ اس سے پہلے مقامی کالج کے طلباء نے احتجاج کرتے ہوئے محمد علی پر الزام لگایا کہ اس کی مِل میں قرآن کے نسخوں کو ری سائیکل کر کے گتّا بنایا جارہا ہے۔ محمد علی کا کہنا تھا کہ میرے مخالفین نے یہ سارا ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔

29 نومبر 2004 کو فیصل آباد کی ڈسٹرکٹ کورٹ نے فیصل آباد کے ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک احمدی محمد اقبال کو توہین رسالت کا مجرم قرار دیتے ہوئے عمر قید کی سزا سنائی۔ اقبال، جس نے نوجوانی میں احمدیت قبول کی تھی، کچھ عرصہ پہلے اپنے آبائی گاؤں واپس آیا تھا۔ 23 مارچ 2004 کو ایک مقامی مسلم مذہبی رہنما اس وقت طیش میں آگیا، جب اقبال نے احمدیت سے تائب ہونے سے انکار کیا۔ مسلم مذہبی رہنما نے دعویٰ کیا کہ اقبال نے ایک مقامی مسجد میں بحث کے دوران حضرت محمدؐ کو جھوٹا نبی کہا ہے۔ احمدی لیڈروں کا کہنا تھا کہ یہ الزام سراسر من گھڑت تھا۔

دسمبر 2004 میں پولیس نے ایک احمدی شہادت علی پر فرد جرم عائد کی کہ اس نے انچا مانگٹ، ضلع حافظ آباد میں قرآن پاک کو آگ لگائی ہے۔ دراصل ملزم نے ردی کاغذات جلائے تھے۔ مقامی بچوں نے کچھ جلے ہوئے کاغذات اٹھائے اور مقامی مُلا کے پاس لے گئے، جو احمدیوں کے خلاف تقریریں کرتا رہتا تھا۔ مُلا نے الزام لگایا کہ جلے ہوئے کاغذات قرآن پاک کے صفحات ہیں۔ شہادت علی کا کہنا تھا کہ یہ پرانے اخبارات کے کاغذ تھے۔ مُلا کے مطالبے پر پولیس نے مقدمہ درج کرلیا اور شہادت علی اور اس کے دو احمدی ساتھیوں کو گرفتار کرلیا۔

17 دسمبر 2004 کو عدالت نے ایک عیسائی انور مسیح کو رہا کردیا، جس پر نومبر 2003 میں توہین مذہب کا مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ انور مسیح کی رہائی کے بعد انتہاپسند تنظیم لشکر مجاہدین کے کارکنوں نے اعلان کیا کہ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ انور مسیح کو روپوش ہونا پڑا۔

20 اپریل کو سپن خاک، ضلع نوشہرہ میں لوگوں کے ہجوم نے ایک شخص عاشق نبی کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔ اس کے چچا نے اس کے خلاف توہین قرآن کا مقدمہ درج کرایا تھا۔ عاشق نبی نے مبینہ طور پر اپنی بیوی کے ساتھ جھگڑے کے دوران قرآن پاک کی بے حرمتی کی تھی۔ پولیس کی گرفتاری سے بچنے کے لئے عاشق اپنے گاؤں سے بھاگ گیا۔ ایک مقامی عالم دین نے فتویٰ دیا کہ عاشق نبی مرتد ہوچکا ہے اور اس کا قتل واجب ہے۔ اس فتویٰ کے بعد تقریباً 400 لوگوں کے ہجوم نے عاشق نبی کو پکڑ لیا اور درخت سے باندھ کر گولی ماردی۔ پولیس نے صحافیوں کو

(Posted on July 20, 2006)

بتایا کہ ہم اس عالم دین کا پتہ چلا رہے ہیں، جس نے فتویٰ دیا تھا تا کہ اسے گرفتار کیا جا سکے۔

احمدیوں کو ایک طرف توہین رسالت قوانین کے تحت اذیتیں دی جاتی ہیں تو دوسری طرف احمدی مخالف قوانین کے تحت بھی ان پر الزامات لگائے جاتے ہیں اور سزائیں دی جاتی ہیں۔ احمدی لیڈروں کے مطابق 39 احمدی، ان قوانین کے تحت لگائے گئے الزامات کی وجہ سے حراست میں ہیں اور 11 سزا کاٹ رہے ہیں۔ احمدی لیڈروں نے یہ بھی بتایا کہ حکومت نے مذہبی وجوہات کی بنا پر احمدیوں کے خلاف ضابطہ تعزیرات کے عام قوانین کا بھی استعمال کیا، جس کی وجہ سے 9 احمدی حراست میں ہیں، لیکن انھیں ابھی سزا نہیں سنائی گئی۔

22 جولائی 2004 کو ایک احمدی مخالف کانفرنس کے بعد مسلمانوں کے ایک ہجوم نے ایک احمدی نوجوان غلام احمد طاہر پر حملہ کر دیا۔ طاہر کو جان بچانے کے لئے بھاگنا پڑا۔ ہجوم نے الزام لگایا کہ طاہر نے ہمیں پتھر مارے ہیں، جس سے ایک مسلمان زخمی ہو گیا ہے اور اس نے پستول سے فائر بھی کیا ہے۔ احمدیوں کا کہنا تھا کہ یہ الزامات درست نہیں اور میڈیکل رپورٹ تیار ہونی چاہیے۔ میڈیکل رپورٹ تو تیار نہیں کی گئی، البتہ طاہر پر مقدمہ دائر کر دیا گیا کہ اس نے حملہ کیا ہے۔

9 اگست 2004 کو چناب نگر میں پولیس نے ایک احمدی محمد احسان پر مسجد کی بے حرمتی کرنے اور اسلحہ رکھنے کا مقدمہ دائر کیا۔ احسان پر، جس کا ذہنی توازن درست نہیں تھا، الزام لگایا گیا کہ وہ ایک چاقو اور احمدیہ لٹریچر کے ساتھ ایک مسجد کی چھت پر چڑھا ہے۔ ذہنی بیماری کے ثبوت کے باوجود پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ وقوعہ کے وقت احسان کے پاس کوئی لٹریچر نہیں تھا اور اسے صرف مذہبی وجوہات کی بنا پر گرفتار کیا گیا۔

نومبر 2004 میں پولیس نے ایک احمدی ذوالفقار گورایہ پر مقدمہ دائر کیا کہ اس نے خود کو مسلمان ظاہر کر کے احمدی مخالف قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔ دراصل گورایہ نے دوستوں کو شادی کارڈ بھیجے تھے، جن پر بسم اللہ کے مخفف اعداد ۷۸۶ اور السلام علیکم اور انشاءاللہ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

حکومت نے مذہبی بنیادوں پر کسی پر بھاری مالی جرمانہ عائد نہیں کیا۔

حکومت نے کسی کو اقلیتی مذہب اختیار کرنے پر تنگ نہیں کیا۔ احمدیہ مذہب اختیار کرنے والوں کو اکثر توہین رسالت، احمدی مخالف قوانین اور دوسرے جرائم کا ملزم قرار دیا گیا۔ حکومت نے اس طرح کے الزامات میں ماخوذ لوگوں کو گرفتار کیا اور ان پر مقدمہ چلایا۔ اقلیتی مذہب اختیار کرنے والوں نے اکثر خفیہ طور پر مذہب تبدیل کیا تا کہ وہ سماجی انتقامی کارروائیوں سے بچے رہیں۔

قدامت پسند مسلمانوں (عموماً دیوبندیوں اور جماعت اسلامی والوں کا) کہنا تھا کہ حکومت نے دہشت گرد اور انتہا پسند گروپوں کے خلاف کارروائی کے دوران بلا جواز ہمارے گھروں، مدرسوں اور مسجدوں پر چھاپے مارے۔ حکومت نے اس طرح کے الزامات کی تردید کی اور کہا کہ جن لوگوں کے خلاف کارروائی کی گئی، ان سب کا ماضی میں ممنوعہ تنظیموں سے تعلق تھا اور ان کے خلاف کارروائی کوئی غلط اقدام نہیں۔

اقلیتی برادریوں نے الزام لگایا کہ حکومت کی اشیر باد سے مسلمان ہماری املاک پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اسی طرح حکومت نے ناجائز کچی بستیاں گرانے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے، اس سے اقلیتیں ہی زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔

22 جولائی 2004 کو یزمان، ضلع بہاولپور میں مقامی سرکاری اہلکاروں نے دو مقامی مسلمانوں کو چار ایکڑ رہائشی زمین الاٹ کی۔ اس زمین پر 26 ہندو خاندان گزشتہ 25 سال سے رہ رہے تھے۔ زمین کی الاٹمنٹ کے خلاف ہندوؤں نے احتجاج کیا، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا، اور مقامی حکومت نے 29 دسمبر کو ان لوگوں کی بے دخلی کا نوٹس جاری کر دیا۔ زیر نظر عرصہ کے اختتام تک صوبائی حکومت سے اس معاملہ پر احتجاج کیا جا رہا تھا، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔

(Posted on July 20, 2006)

12 اگست 2004 کو بستی بوہڑ کے عیسائیوں کو پتہ چلا کہ مقامی مسلمانوں نے ان کے قبرستان کی دو ایکڑ زمین زرعی مقصد کے لئے قبضے میں لے لی ہے۔ عیسائیوں نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی، جس پر تفتیش کا حکم دیا گیا۔ تادمِ تحریر تفتیش جاری تھی، تاہم زمین کا قبضہ مسلمانوں کے پاس تھا۔

29 نومبر 2004 کو لوگھڑ ضلع قصور میں عیسائیوں نے اپنے مکانوں کی تباہی کے خلاف احتجاج کیا۔ ایک بااثر مسلمان لیڈر نے مبینہ طور پر ان کے مکانوں پر بلڈوزر چلا دیا تھا اور ان کا قیمتی سامان اٹھوا لیا تھا۔ وہ اپنی جائداد تک سڑک بنوانا چاہتا تھا۔ عیسائیوں نے ہائی کورٹ سے حکم حاصل کر رکھا تھا، جس میں مکان گرانے کی ممانعت کی گئی تھی، لیکن پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی۔

حکومت نے کسی کو مذہبی عقائد کی بنیاد پر جبری مشقت یا غلامی پر مجبور نہیں کیا۔ تاہم مذہبی اقلیتی لیڈروں نے بتایا کہ حکومت نے اینٹ کے بھٹوں اور زرعی شعبے میں جبری مشقت کے خاتمے کے لئے مناسب اقدامات نہیں کئے۔ عیسائی اور ہندو لوگ، جبری مشقت کا زیادہ شکار ہوئے۔ جون میں پولیس نے صوبہ پنجاب کے ضلع شیخوپورہ میں چھاپے مار کر 300 سے زیادہ لوگوں کو رہا کرایا، جو بھٹوں پر جبری مشقت کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر مزدور عیسائی تھے۔

مسلمانوں نے بتایا کہ سرکاری فوجوں نے وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) میں فوجی آپریشن کے دوران مسجدوں اور مدرسوں کو نقصان پہنچایا۔ تاہم حکومت نے ان الزامات کی سختی سے تردید کی۔

جبری تبدیلیٔ مذہب

اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے بعض لوگوں نے سماجی حالات سے مجبور ہو کر اسلام قبول کیا۔ مذہبی اقلیتوں نے بتایا کہ حکومت نے اس مسئلے پر قابو پانے کے لئے مناسب اقدامات نہیں کئے۔

27 اگست 2004 کو ایک مسلمان مرد نے فیصل آباد میں ایک 15 سالہ عیسائی لڑکی ثمینہ اسحاق کو اغوا کر لیا اور اسے مجبور کیا کہ وہ اسلام قبول کر لے اور اس سے نکاح کر لے۔ یکم ستمبر کو عیسائی این جی اوز کی مداخلت پر پولیس نے ثمینہ کو آزاد کرا لیا اور متعلقہ مسلمان کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کر لیا۔

کسی نابالغ امریکی شہری کے اغوا ہونے یا اسے امریکہ سے غیر قانونی طور پر باہر لے جانے اور اس کا مذہب جبراً تبدیل کرنے کے کسی واقعے کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ البتہ اس طرح کے شہریوں کی امریکہ واپسی میں رکاوٹ ڈالنے کی اطلاعات ملی ہیں۔

دہشت گرد تنظیموں کی کارروائیاں

ایسے افراد یا تنظیموں کی طرف سے، جنھیں وزیرِ خارجہ نے امیگریشن اینڈ نیشنلٹی ایکٹ کے سیکشن 219 کے تحت دہشت گرد تنظیمیں قرار دے رکھا ہے، مخصوص مذہبی گروپوں کے خلاف کارروائیاں کرنے کے متعدد واقعات پیش آئے۔

زیرِ نظر عرصہ کے دوران پاکستان بھر میں فرقہ وارانہ تشدد میں کمی آئی۔ شیعہ لیڈروں نے بتایا کہ ملک میں اور خصوصاً کراچی میں شیعہ

(Posted on July 20, 2006)

مسلک سے تعلق رکھنے والے پروفیشنلز کو قتل کرنے کے واقعات تقریباً ختم ہو گئے۔اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ایک تو شیعہ، ایم ایم اے میں شامل ہیں، اور دوسرے سُنی فرقوں سے ان کے تعلقات میں عمومی بہتری آئی ہے۔

اسی عرصہ کے دوران سُنی فرقوں کے درمیان بھی ملک کے بیشتر حصوں میں تشدد میں بظاہر کمی آئی۔ دیوبندیوں نے بتایا کہ سُنی تحریک نے سندھ میں دیوبندی علماء اور عام دیوبندیوں کو قتل کرانے کا سلسلہ بہت حد تک ترک کر دیا ہے۔البتہ دیوبندی لیڈروں نے تشدد کے ایک واقعے کے بارے میں بتایا، جو 9 اکتوبر 2004 کو اس وقت پیش آیا، جب کراچی میں نامعلوم مسلح افراد نے مفتی جمیل احمد خان اور ان کے ایک ساتھی کو ان کی گاڑی میں قتل کر دیا۔ممکن ہے یہ قتل، دیوبندی اور شیعہ فرقوں میں اس تشدد کا نتیجہ ہو، جس کا سلسلہ ان دنوں پنجاب میں چل رہا تھا۔30 مئی کو نامعلوم حملہ آوروں نے کراچی میں جماعت اسلامی کے ایک اعلیٰ عہدیدار اسلم مجاہد کو اغوا کرنے کے بعد اذیتیں دے کر قتل کر دیا۔اس قتل کے محرکات معلوم نہیں ہو سکے، تاہم یہ واقعہ بظاہر سیاسی تشدد کا شاخسانہ تھا۔

صورتحال میں بہتری کے باوجود کئی تشویشناک رجحانات برقرار رہے۔فرقہ پرست انتہاپسندوں اور دہشت گرد گروپوں نے عبادت گاہوں اور مذہبی اجتماعات پر حملے جاری رکھے۔اکتوبر 2004 میں فرقہ وارانہ تشدد دوبارہ بھڑک اٹھنے پر حکومت نے انتہاپسند مذہبی تنظیموں کے جلسے جلوسوں کو ممنوع قرار دے دیا۔دیوبندی انتہاپسند گروپوں میں لشکر جھنگوی شامل ہے، جسے امریکہ نے دہشت گرد تنظیم قرار دے رکھا ہے، جبکہ دوسرا انتہاپسند گروپ سپاہ صحابہ ہے، جو پاکستانی قانون کے تحت ایک ممنوعہ تنظیم ہے۔

اکتوبر 2004 میں پنجاب میں تشدد کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا، جو کئی سال سے بند تھا۔یکم اکتوبر کو ایک خودکش حملہ آور نے، جس کا تعلق غالباً لشکر جھنگوی سے تھا، سیالکوٹ میں نماز جمعہ کے دوران ایک شیعہ مسجد پر حملہ کیا، جس سے 31 افراد ہلاک اور 40 سے زیادہ زخمی ہو گئے۔انتقامی کارروائی کے طور پر 7 اکتوبر کو شیعہ انتہاپسند تنظیم سپاہ محمد کے ایک کارکن امجد شاہ نے، جسے بعد میں گرفتار کر لیا گیا ، دیوبندی انتہاپسند لیڈر مولانا اعظم طارق کی برسی کے اجتماع میں دو دھماکے کئے، جس سے 39 افراد ہلاک اور 100 زخمی ہو گئے۔10 اکتوبر کو ایک خودکش حملہ آور نے، جس کا تعلق لشکر جھنگوی سے تھا، لاہور کی ایک شیعہ مسجد میں دھماکا کیا، جس سے 4 افراد ہلاک اور 10 زخمی ہو گئے۔

2005 میں صوفیا کے مزاروں پر ہونے والی تقریبات پر حملوں کا ایک نیا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، جو غالباً دیوبندی انتہاپسندوں نے شروع کیا۔یہ انتہاپسند صوفیا کے مزاروں پر ہونے والی تقریبات کو بت پرستی کہتے ہیں۔19 مارچ کو بلوچستان کے ضلع جھل مگسی میں پیر سید رکھیل شاہ کے مزار پر اس وقت دھماکا ہوا، جب شیعہ اور بریلوی، وہاں عرس منا رہے تھے۔اس دھماکے میں 40 سے زیادہ افراد ہلاک اور 100 سے زیادہ زخمی ہو گئے۔حکومت نے لشکر جھنگوی کو اس حملے کا ذمہ دار قرار دیا۔27 مئی کو ایک خودکش حملہ آور نے اسلام آباد کے قریب بری امام کے عرس کے موقع پر دھماکا کیا۔اس دھماکے میں کم از کم 20 افراد ہلاک اور کم از کم 100 افراد زخمی ہوئے۔

8 جنوری کو دیوبندی انتہاپسندوں نے گلگت، شمالی علاقہ جات میں ایک شیعہ عالم دین آغا ضیاالدین رضوی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس پر وہاں فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا، اور گلگت، کریم آباد اور سکردو میں ہونے والے ہنگاموں میں شیعہ مظاہرین نے 15 سُنیوں کو ہلاک کر دیا۔علاقے کے باخبر ذرائع کے مطابق شیعہ اور دیوبندی انتہاپسند گروپوں نے ان ہنگاموں کے بعد علاقے میں اپنی سرگرمیاں بڑھا دیں۔انھوں نے اپنے اپنے مسلح کیمپ قائم کر لئے، جس سے امن وامان کا سنگین مسئلہ پیدا ہو گیا۔دونوں طرف کے انتہاپسندوں نے ایک دوسرے کے فرقے کے افراد اور املاک پر حملے کئے۔دونوں فریقوں نے گلگت میں آغاخانیوں کو تنگ کیا اور ان پر حملے کئے اور الزام لگایا کہ وہ ہمارے مخالف گروپ کی مدد کر رہے ہیں۔23 مارچ کو شیعہ حملہ آوروں نے گلگت میں شمالی علاقہ جات کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس سخی اللہ ترین کو قتل کر دیا۔گلگت میں فرقہ وارانہ کشیدگی برقرار رہی، البتہ شمالی علاقہ جات کے دوسرے حصوں میں صورتحال معمول پر

(Posted on July 20, 2006)

آ گئی۔

30 مئی کو ایک خودکش حملہ آور اور اس کے 3 ساتھیوں نے کراچی میں ایک شیعہ مسجد پر حملہ کیا اور 5 افراد کو ہلاک اور کم از کم 30 کو زخمی کر دیا۔ حکومت نے اسے فرقہ وارانہ حملہ قرار دیا اور لشکر جھنگوی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔

آغا خان کے پیروکار ''اسماعیلی'' پہلی مرتبہ تشدد کے خطرے سے دوچار ہوئے۔ دیوبندی انتہاپسندوں نے گلگت میں اسماعیلیوں پر حملوں کے علاوہ شمالی علاقہ جات اور قریبی صوبہ سرحد کے ضلع چترال میں آغا خان فاؤنڈیشن کے قائم کردہ اسکولوں اور ہسپتالوں میں توڑ پھوڑ کی۔ 27 دسمبر کو نامعلوم حملہ آوروں نے، جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ دیوبندی انتہاپسند گروپوں سے تعلق رکھتے تھے، چترال میں آغا خان ہیلتھ سروس آفس کے دو اسماعیلی ملازمین کو ہلاک کر دیا اور ہیلتھ سروس آفس کی گاڑیوں کو آگ لگا دی۔

القاعدہ سے تعلق رکھنے والی تنظیموں نے ملک میں اپنا نیٹ ورک قائم کئے رکھا اور اس کے حامی وقتاً فوقتاً یہود مخالف بیانات جاری کرتے رہے۔ ایک دہشت گرد تنظیم لشکر طیبہ کا لیڈر حافظ سعید یہودیوں اور ہندوؤں کے خلاف جہاد شروع کرنے کے لئے مسلسل بیانات دیتا رہا۔ حکومت نے القاعدہ سے تعلق رکھنے والی انتہاپسند تنظیم جنداللہ کے 10 ارکان پر فرد جرم عائد کی کہ وہ 15 جنوری 2004 کو کراچی میں پاکستان بائبل سوسائٹی کے آفس پر حملوں سمیت متعدد حملوں میں ملوث ہیں۔

انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت حکومت نے متعدد انتہاپسند مذہبی اور دہشت گرد تنظیموں کی سرگرمیوں اور ان کی رکنیت سازی کو ممنوع قرار دے دیا۔ اس ایکٹ کے تحت حکومت تشدد، دہشت گردی، مذہبی منافرت پھیلانے والی تقریروں یا اقدامات اور ملک دشمن جرائم پر خصوصی عدالتوں میں مقدمہ چلا سکتی ہے۔ تاہم کئی ایسی تنظیمیں، جنھیں حکومت نے ممنوع قرار دے رکھا ہے، سرگرم عمل رہیں۔

مذہبی آزادی کی صورتحال میں بہتری اور مثبت رجحانات

حکومت نے اس عرصہ کے دوران، جس کا احاطہ زیرنظر رپورٹ میں کیا گیا ہے، مذہبی آزادی کے فروغ کے لئے اقدامات کئے۔

جنوری 2005 میں صدر پاکستان نے انسداد توہین مذہب اور حدود قوانین پر عملدرآمد کے نئے ضابطہ کار کی منظوری دی۔ نئے ضوابط کے مطابق توہین مذہب کا کوئی بھی کیس درج کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اعلیٰ پولیس افسران الزامات کی چھان بین کریں اور حدود قوانین کے تحت کسی عورت کو ماورائے شادی جنسی تعلقات کے جرم میں حراست میں لینے سے پہلے اس کے لئے عدالتی حکم حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ انسانی حقوق کے کارکن، جو 2000 سے مذکورہ بالا قوانین میں ردوبدل کا مطالبہ کر رہے تھے، نئے ضوابط سے مطمئن نہیں اور وہ ان قوانین کو مکمل طور پر منسوخ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ تاہم ابتدائی اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت نے ضوابط میں جو تبدیلی کی ہے، اس سے قوانین کے غلط استعمال کے رجحان میں کمی آئی ہے۔ مئی میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین نے واضح کیا کہ ''حدود قوانین کوئی صحیفہ آسمانی نہیں۔ ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔''

حکومت نے ملک میں دہشت گرد اور فرقہ پرست تنظیموں پر پابندی برقرار رکھی۔ ان تنظیموں کے اثاثے بدستور منجمد رکھے گئے اور ان کے نامزد لیڈروں کی نگرانی کی جاتی رہی۔ اگرچہ بیشتر ممنوعہ تنظیموں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی کوشش کی، لیکن ان کی نگرانی کرنے، ان کے ٹھکانوں پر چھاپے مارنے، ان کے لیڈروں اور کارکنوں کو حراست میں لینے اور انھیں مالی وسائل سے محروم کرنے کی حکومتی پالیسیوں کے باعث ان تنظیموں کی سرگرمیوں کی روک تھام میں مدد ملی۔

حکومت نے مختلف مکاتب فکر کے بورڈز یا وفاق سے مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھا، جو ملک میں کثیر تعداد میں دینی مدارس کو کنٹرول کرتے ہیں۔ زیرنظر رپورٹ میں جس مدت کا احاطہ کیا گیا ہے، اس کے دوران وفاق المدارس نے تفتیش کاروں کی خدمات حاصل کیں تاکہ اس

(Posted on July 20, 2006)

بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ تمام ملحقہ مدارس، مذہبی اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے پر عائد پابندی اور مدارس کو دہشت گردوں یا انتہا پسندوں کی بھرتی کے لئے استعمال نہ کرنے کی پابندی پر عمل کریں۔ وفاق المدارس نے مدارس میں مرحلہ وار جدید علوم مثلاً انگریزی، ریاضی اور سائنس کے مضامین کی تدریس بھی متعارف کرانا شروع کی، جس کا مطالبہ حکومت نے کیا تھا۔ وفاق المدارس نے حکومت کی اس شرط پر بھی عمل شروع کیا کہ غیر ملکی طلبا کے بارے میں اطلاع دی جائے اور حسابات کی جانچ پڑتال کرائی جائے۔ مئی میں وزیر تعلیم کی طرف سے ایک مدرسہ اصلاحی کمیٹی قائم کی گئی تا کہ مدارس کی رجسٹریشن اور امتحانات کے طریقہ کار اور 100 ملین ڈالر (اندازاً 5.8 ارب روپے) کی دستیاب رقم کی تقسیم جیسے معاملات طے کئے جاسکیں۔ تاہم زیر نظر عرصہ کے اختتام تک کمیٹی کوئی بڑی پیشرفت نہیں کرسکی اور مدارس کے لئے دستیاب فنڈز استعمال نہیں ہوئے۔

مارچ 2005 میں حکومت نے انسانی حقوق کمیشن کے قیام کے لئے ایک مسودہ قانون پیش کیا۔ حکومت نے بین الاقوامی برادری کے ساتھ مل کر کام جاری رکھا تا کہ مسودہ قانون میں اصلاح کی جائے اور اس طرح انسانی حقوق کی نگرانی اور حفاظت کرنے والا ایک مضبوط اور غیر جانبدار ادارہ قائم ہوسکے۔

حکومت نے 2001 میں انسانی حقوق کے بارے میں عوام میں شعور پیدا کرنے کے لئے ایک تین سالہ پروگرام شروع کیا، جس کے لئے ایشیائی ترقیاتی بنک نے فنڈز فراہم کئے۔ یہ پروگرام 2004 میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس مہم میں کئی این جی اوز کو بھی شریک کیا گیا۔ حکومت نے پولیس کی تربیت کے پروگرام میں بھی انسانی حقوق کی آگہی کا مضمون شامل کیا۔

مئی میں 58 مذہبی لیڈروں نے، جو ملک کے 6 بڑے مکاتب فکر کی نمائندگی کر رہے تھے، مشترکہ طور پر فتویٰ جاری کیا، جس میں مسلمانوں پر فرقہ وارانہ حملوں کے علاوہ غیر مسلموں کے قتل کو مذموم قرار دیا گیا۔ وزیر مذہبی امور نے فتویٰ کے اجرا کے لئے سرگرمی سے کوششیں کیں۔

ستمبر 2004 میں مسلمان، عیسائی، ہندو، سکھ، بودھ اور پارسی لیڈروں نے اسلام آباد میں عالمی مذاہب کونسل کا افتتاحی اجلاس منعقد کیا۔ صدر مشرف نے اس اجلاس کے انعقاد اور کونسل کی تشکیل میں بھرپور مدد دی اور پہلے اجلاس کی صدارت بھی کی۔ کونسل کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان مکالمے اور روابط کو فروغ دیا جائے۔ کونسل نے ملک بھر میں اپنے اجلاس منعقد کئے، جن کے لئے مقامی اور صوبائی حکومتوں نے تعاون کیا۔ مذہبی امور کی وزارت اور اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی کئی بین المذاہب اجلاسوں، مکالموں اور مختلف مکاتب فکر کے درمیان اجلاسوں کا اہتمام کیا۔ ان اجلاسوں کے نتیجے میں دیوبندی اور جماعت اسلامی کے مذہبی اور سیاسی لیڈروں نے عیسائیوں اور ہندوؤں کے خلاف بیان بازی میں خاصی نرمی کردی۔

2004 کی کرسمس کے موقع پر حکومت نے "روشن خیال اعتدال پسندی" کی اپنی پالیسی سے گہری وابستگی کا اظہار کیا۔ یہ نظریہ مذہبی رواداری اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صدر سمیت مختلف لیڈروں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر زور دیا اور سرکاری ٹیلی ویژن نے اپنے بیشتر پروگرام کرسمس کے حوالے سے پیش کئے، جب کہ اس سے پہلے ہمیشہ بانیِ پاکستان محمد علی جناح کے یوم ولادت کے حوالے سے ہی زیادہ تر پروگرام نشر ہوتے تھے۔ ان کا یوم ولادت بھی 25 دسمبر ہے۔

عدالتوں نے مذہب سے تعلق رکھنے والے مقدمات میں قانون کو منصفانہ انداز میں استعمال کرنے کے لئے بعض اقدامات کئے۔ عدالتوں نے توہین مذہب کے دو ملزمان کو زیر نظر عرصہ کے دوران رہا کیا۔ ستمبر 2004 میں لاہور کی سیشن کورٹ نے ایک مسلمان افتخار احمد کو رہا کیا، جس پر 2000 میں قرآن پاک کی توہین کا الزام تھا۔ عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ افتخار احمد کا ذہنی توازن درست نہیں۔ دسمبر

(Posted on July 20, 2006)

2004 میں عدالت نے انور مسیح کو رہا کر دیا، جس پر 2003 میں توہین رسالت کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ عدالت نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انور مسیح کے خلاف تمام شہادتیں، افواہوں پر مبنی ہیں۔ نومبر 2004 میں پشاور ہائی کورٹ نے فرنٹیئر پوسٹ کے سابق کا پی ایڈیٹر منور محسن کو توہین رسالت کیس میں بری کر دیا۔ اس پر 2003 میں ایڈیٹر کے نام آنے والا ایک ایسا خط اخبار میں شائع کرنے کا الزام تھا، جو توہین رسالت پر مبنی تھا۔

حکومت نے جماعت اسلامی اور دیوبندی لیڈروں کے اس مطالبے کے جواب میں کہ آغا خانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے، واضح کیا کہ یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ حکومت نے آغا خان فاؤنڈیشن کے ترقیاتی کام کی علانیہ حمایت کی۔ صدر پاکستان نے آغا خان سے باقاعدہ رابطے رکھے اور مئی میں ان کے ہمراہ شمالی علاقہ جات کا دورہ کیا، جہاں آغا خان کے بیشتر پیروکار رہتے ہیں۔ حکومت نے مسلم لیڈروں کے اس دباؤ کی بھی پروا نہیں کی کہ نصاب تعلیم میں اصلاحات کا عمل اور قومی تعلیمی امتحانی بورڈ کا طریقہ کار ترک کر دیا جائے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق سعودی عرب میں 40 پاکستانی عیسائیوں کو مرتد ہونے کے الزام میں گرفتار کیا گیا، جنھیں حکومت پاکستان کے دباؤ کے نتیجے میں رہائی ملی۔

سیکشن iii سماجی رویے

ملک کی مذہبی برادریوں کے درمیان تعلقات کشیدہ رہے۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف اور مسلم فرقوں کے درمیان تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔ بیشتر لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ بہت معمولی تعداد میں لوگ اس تشدد کے ذمہ دار ہیں۔ تاہم امتیازی قوانین اور پبلک اسکولوں میں مذہبی تعصب پر مبنی تعلیم نے بھی کسی حد تک اس طرح کے تشدد کی فضا پیدا کی۔ پولیس نے بعض اوقات تشدد روکنے یا تشدد میں ملوث افراد کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے انکار کیا۔

احمدی اور ان کے ادارے طویل عرصہ سے مذہبی تشدد کا نشانہ بنتے چلے آرہے ہیں۔ یہ تشدد زیادہ تر منظم مذہبی انتہا پسندوں کی تحریک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ احمدی لیڈروں کا کہنا ہے کہ جنگجو سُنی مُلا اور ان کے پیروکار بعض اوقات وسطی پنجاب میں احمدی اکثریت والے شہر اور احمدیوں کے روحانی مرکز ربوہ میں سڑکوں پر جلوس نکالتے ہیں۔ یہ مُلا 100، 200 لوگوں کی قیادت کرتے ہوئے احمدیوں اور ان کے مذہب کے بانی پر لعن طعن کرتے ہیں، جس سے بعض اوقات تشدد تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ احمدیوں کا کہنا ہے کہ پولیس اس طرح کے جلوسوں کے دوران عموماً موجود ہوتی ہے، لیکن تشدد روکنے کے لئے کچھ نہیں کرتی۔

23 جولائی 2004 کو کئی ہزار سُنی مسلمانوں نے احمدی اکثریت والے شہر چناب نگر (ربوہ) میں ایک مقامی تھانے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے خلاف مظاہرہ کیا۔ اس تھانے میں ایک چھوٹی سی عارضی مسجد بھی تھی، جسے احمدیوں سے عاریتاً لی جانے والی زمین پر تعمیر کیا گیا تھا۔ مقامی مسلمان قیادت نے مسجد کی زمین اس کے احمدی مالکان کو واپس کرنے پر اعتراض کیا۔ 6 ستمبر کو صوبائی حکومت نے عوامی دباؤ میں آکر وہ جگہ دوبارہ پولیس کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا۔

30 جولائی 2004 کو نامعلوم حملہ آوروں نے لاہور میں ایک احمدی شاہد احمد ڈار پر گولی چلا دی، جو بازار سے سودا خریدنے کے بعد گھر واپس آرہا تھا۔ حملہ آوروں نے ڈار پر فائر کرنے سے پہلے اس کے مذہب کے خلاف نعرے لگائے۔ شاہد احمد حملے میں محفوظ رہا۔

11 اگست 2004 کو مقامی مسلم لیڈروں کی قیادت میں ایک ہجوم نے ضلع گوجرانوالہ کے قصبہ تتلے عالی میں اس جگہ حملہ کر دیا، جہاں احمدی اپنے لئے عبادت گاہ تعمیر کر رہے تھے۔ پولیس نے احمدیوں کو حکم دیا کہ تعمیر روک دی جائے۔ احمدیوں نے عبادت گاہ کی تعمیر جاری رکھنے کے لئے مقامی حکام سے اجازت نامہ حاصل کر لیا، لیکن بلوائیوں نے پھر ہلہ بول دیا اور پولیس نے غیر معینہ عرصہ کے لئے عبادت گاہ کی

(Posted on July 20, 2006)

تعمیر رکوادی۔

21 اگست کو نامعلوم حملہ آوروں نے سرگودھا میں ایک احمدی وکیل اور مقامی احمدی برادری کے صدر برکت اللہ مانگلہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ حملہ اس وقت کیا گیا، جب برکت اللہ تھوڑی دیر پہلے نماز عشاء ادا کرنے کے بعد گھر لوٹا تھا۔ حملہ آوروں نے اس کے دروازے پر دستک دی، اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور موقع ملتے ہی اس کے باغیچے میں اسے گولی مار کر قتل کر دیا۔ اس قتل کے سلسلے میں تادم تحریر کوئی شخص گرفتار نہیں ہوا تھا۔

نومبر 2004 میں محمد اسحاق دانش نامی ایک شخص نے احمدیت قبول کر لی۔ جب اس کے بھائی کو معلوم ہوا تو اس نے ہاکی سے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا اور پھر اسے اپنے آبائی گھر سے نکال دیا۔

20 دسمبر 2004 کو کچھ احمدی ساہیوال، ضلع سرگودھا میں ایک مکان کی چھت تبدیل کر رہے تھے، جسے عبادت گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ مقامی مسلم مذہبی لیڈروں کے اشتعال دلانے پر تقریباً 30 لوگوں کے ہجوم نے عمارت پر ہلہ بول دیا اور نئی چھت اور عبادت گاہ کے کمرے میں موجود سامان کو آگ لگا دی۔ پولیس نے حملے کے ذمہ دار لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

زیر نظر رپورٹ کے عرصہ کے دوران عیسائیوں کے خلاف مذہبی بنیادوں پر تشدد ہوتا رہا۔

20 اور 24 اکتوبر 2004 کو نامعلوم حملہ آوروں نے راولپنڈی میں ایک گرجا گھر کے احاطہ میں بم پھینکے۔ دونوں واقعات میں گرجا گھر کے عملے کو گرینیڈز ملے اور انھوں نے پولیس سے رابطہ کیا۔ بم ڈسپوزل یونٹ نے ان گرینیڈز کو پھٹنے سے پہلے ناکارہ بنا دیا۔

16 مارچ کو ایک ہجوم نے 60 سے زیادہ خواتین کے ایک گروپ پر حملہ کر دیا، جو عبادت اور روزے کیلئے اسلام آباد میں مسکین مشرف کالونی میں ایک گرجا گھر میں جمع تھیں۔ 150 سے زیادہ لوگوں نے ان خواتین پر حملہ کیا، انھیں بالوں سے گھسیٹا، مارا پیٹا اور گرجا گھر کی املاک کو نقصان پہنچایا۔ مقامی امام مسجد نے اپنی مسجد سے 100 میٹر دور اس گرجا گھر کی تعمیر پر اعتراض کیا تھا اور اس نے اور اس کے طلبا نے خواتین پر ہونے والے حملے کی مبینہ طور پر قیادت کی۔

28 مارچ کو لاہور میں پانچ بندوق برداروں نے عیسائیوں پر گولی چلا دی، جو ایسٹر کی عبادت کے بعد گرجا گھر سے نکل رہے تھے۔ فائرنگ سے ایک شخص ہلاک اور سات زخمی ہو گئے۔ پولیس نے حملہ آوروں میں سے دو کو گرفتار کر لیا۔ اس حملے کی بنیاد، بظاہر مقامی مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان زمین کا تنازع تھا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ عیسائی اس زمین سے دستبردار ہو جائیں، جہاں ان کا گرجا گھر اور قبرستان تھا۔ یہ زمین کئی عشرے پہلے مسلمانوں کے بزرگوں نے عیسائیوں کو دی تھی، جو لاہور کی توسیع کی وجہ سے اب بہت مہنگی ہو گئی تھی۔

7 اپریل کو پادری شمعون بابر اور اس کا ڈرائیور ڈینیئل عمانوئیل پشاور کی ایک سڑک پر مردہ پایا گیا۔ نامعلوم حملہ آوروں نے انھیں 5 اپریل کو اغوا کیا تھا۔ پولیس کی تفتیش کے مطابق دونوں پر تشدد کیا گیا اور پھر ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان پر کئی گولیاں چلائی گئیں۔ بعض اطلاعات میں یہ بھی بتایا گیا کہ شمعون بابر کی لاش مسخ شدہ حالت میں تھی۔ بابر کے اہل خانہ کا کہنا تھا کہ بابر کو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ دھمکیاں مل چکی تھیں کہ وہ مذہبی سرگرمیاں بند کر دے۔ پولیس نے شبہ ظاہر کیا کہ بابر کا کاروبار، جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا، اس واردات کا سبب بنا۔ تاہم کُل پاکستان اقلیتی اتحاد نے خیال ظاہر کیا کہ اس واردات کے پیچھے مذہبی تعصب کارفرما ہے۔

23 اپریل کو سات آٹھ مسلمان نوجوانوں نے ضلع منڈی بہاء الدین میں ایک کیتھولک عیسائی شہباز مسیح پر حملہ کیا۔ وہ اسے گھسیٹ کر ایک کھیت میں لے گئے اور مار مار کر اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دیں اور پھر وہاں سے فرار ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے شہباز کے والدین سے رابطہ کیا اور انھیں بتایا کہ شہباز قتل ہو گیا ہے۔ شہباز کے والدین اسے ڈھونڈ کر ایک مقامی ہسپتال میں لے گئے۔ مقامی عیسائی لیڈروں کے

مطابق شہباز مسیح ایک مسلمان کے ہاں ملازم تھا اور مالک کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات تھے، جو حملہ آوروں کو ناگوار گزرتے تھے۔ علاقے کے مسلمانوں کو اس بات پر غصہ تھا کہ شہباز مسیح پوری طرح اپنے مالک کا نوکر بن کر نہیں رہتا۔

ہندوؤں کو تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے مندروں کو اکثر نشانہ بنایا گیا۔ جرائم پیشہ لوگوں نے، بالخصوص کراچی میں، ہندو تاجروں کو اغوا کیا۔ ہندوؤں نے بتایا کہ پولیس اغوا شدہ ہندوؤں کو چھڑانے کے لئے کچھ نہیں کرتی، جس کی وجہ سے ہمیں خود تاوان دے کر اپنے بندے چھڑانا پڑتے ہیں۔

21 مئی کو نامعلوم افراد نے ضلع سانگھڑ میں سنجیرو کے مقام پر ایک ہندو مندر کے نگران بھگت موہن بھیل کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد حملہ آوروں نے مندر میں سامان الٹ پلٹ دیا اور مورتیوں کو توڑ ڈالا۔ پولیس نے کوئی گرفتاری نہیں کی۔ 15 اکتوبر 2004 کو نامعلوم افراد نے حیدرآباد میں اسلحہ کے زور پر بابا گنگا ناتھ مندر پر قبضہ کر لیا۔ پولیس نے قبضہ چھڑانے کے لئے کوئی کارروائی نہیں کی۔

ماضی میں سکھوں کو کسی سماجی تشدد کا سامنا نہیں کرنا پڑا، تاہم 25 ستمبر کو مسلمانوں کے ایک ہجوم نے ننکانہ صاحب میں سکھ گوردوارہ جنم استھان پر حملہ کر دیا اور اسے نقصان پہنچایا۔ لوگوں کو حکومت کی اس رپورٹ پر غصہ تھا کہ جس جگہ گرونانک ڈگری کالج قائم ہے، وہ حقیقتاً گوردوارہ کی زمین ہے۔ قومی اسمبلی نے پنجاب کی صوبائی حکومت پر زور دیا کہ مجرموں کو سزا دی جائے۔ پولیس نے اس کیس میں کئی افراد کو گرفتار کیا۔ مئی 2005 میں پنجاب کی حکومت نے ایک نوٹیفیکیشن کے ذریعے ننکانہ صاحب کو ضلع کا درجہ دے دیا۔ اس سے علاقے کو اضافی خود مختاری مل گئی اور محصولات کی آمدنی بھی بڑھ گئی، جس سے سکھ برادری کو مطمئن کرنے میں مدد ملی۔

احمدیوں کو تنگ کیا جاتا رہا اور ان سے تعصب کا برتاؤ کیا جاتا رہا۔ اگر کسی کے بارے میں محض یہ افواہ پھیل جائے کہ وہ شخص احمدی ہے یا اس کے رشتہ دار احمدی ہیں تو پھر اسے ملازمت ملنے یا ترقی ملنے کے امکانات معدوم ہو سکتے ہیں۔ بیشتر احمدی، گھروں پر یا احمدیوں کے نجی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ پبلک اسکولوں میں احمدی طلبا کو اکثر ان کے غیر احمدی ہم جماعتوں نے تنگ کیا۔ ایسے اسکولوں میں، جہاں احمدی طلبا کی اکثریت تھی، حکومت نے جو اساتذہ مقرر کئے، وہ نااہل تھے۔ صدر مشرف نے 2002 میں علمائے اسلام کے ایک سوال کے جواب میں، جو کہتے تھے کہ صدر احمدیوں کی زیادہ حمایت کر رہے ہیں، یہ اعلان کیا کہ میں احمدیوں کو غیر مسلم سمجھتا ہوں۔

زیادہ تر عیسائی غریب ترین طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سے تعصب بھی برتا جاتا ہے۔ اس کی وجہ مذہب سے زیادہ نسل اور سماجی عوامل ہو سکتے ہیں۔ بہت سے غریب عیسائی، اپنے نچلی ذات کے ہندو آباؤ اجداد کے پیشہ سے وابستہ ہیں، جو زیادہ تر اچھوت تھے۔ معاشرے میں عیسائیوں کا مقام اگرچہ ماضی کے مقابلے میں قدرے بہتر ہوا ہے، لیکن کوئی زیادہ فرق نظر نہیں آتا، حالانکہ انھیں 100 سال سے زیادہ عرصہ سے مشنریوں کی طرف سے مسلسل مدد اور رہنمائی مل رہی ہے۔ ایسے پبلک اسکولوں میں، جہاں اکثریت مسلم طلبا کی ہوتی ہے، عیسائی طلبا کو الگ میز پر بیٹھ کر کھانا پینا پڑتا ہے۔

اسماعیلیوں کی طرف سے اطلاع ملی کہ انھوں نے اقتصادی طور پر جو ترقی کی ہے، اس کی وجہ سے سُنی مسلمان ان سے حسد کرتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے اسماعیلیوں کو ہراساں کرنے کی کوئی اطلاع نہیں ملی، تاہم اسماعیلیوں کا کہنا ہے کہ ان پر اکثر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ قدامت پسند مسلمانوں کے بعض طور طریقے اپنائیں ورنہ ان کا سماجی بائیکاٹ ہو سکتا ہے۔

اگرچہ ملک میں کوئی یہودی شہری نہیں، تاہم اخبارات میں یہودیوں کے خلاف اکثر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ این جی اوز نے بتایا کہ 1992 میں بھارت کے اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم ہونے کے بعد پاکستان کے ذرائع ابلاغ، جن میں عام ذرائع ابلاغ اور اسلامی ذرائع ابلاغ دونوں شامل ہیں، بھارت کو بعض اوقات ''پاکستان کی سرحدوں پر موجود صیہونی خطرہ'' کہتے ہیں۔

(Posted on July 20, 2006)

تاہم سرکاری اقدامات میں ذرائع ابلاغ کے رویے کی جھلک نظر نہیں آتی۔ حکومت نے 2002 میں وال اسٹریٹ جرنل کے نامہ نگار ڈینیئل پرل کے اغوا اور قتل کے ذمہ دار لوگوں کو پکڑنے میں تعاون کیا۔

بعض سُنی مسلم گروپوں نے لٹریچر شائع کیا، جس میں لوگوں کو احمدیوں، شیعہ مسلمانوں اور دوسرے سُنی فرقوں، آغا خانیوں اور ہندوؤں کے خلاف تشدد پر اکسایا گیا۔ بعض اخبارات نے اکثر ایسے مضامین شائع کئے، جن میں مذہبی اقلیتوں خاص کر احمدیوں، ہندوؤں اور یہودیوں کے خلاف ہتک آمیز زبان استعمال کی گئی۔ مسجدوں میں خطبوں میں اکثر احمدیوں، دوسرے مسلم گروپوں اور ہندوؤں اور آغا خانیوں کے خلاف بیانات دیئے گئے۔

مسلمانوں میں تبدیلیِ مذہب کو سماجی طور پر نامناسب تصور کیا جاتا ہے۔ اس تصور کی وجہ سے مشنریوں کو بعض اوقات مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر بعض سنی مسلم گروپوں نے مشنریوں کی سرگرمیوں کی مخالفت کی اور بعض اوقات مشنریوں کو دھمکیاں بھی دی گئیں کہ وہ اپنی سرگرمیوں سے باز آجائیں۔

حصول ملازمت کے سلسلے میں مذہب کی بنیاد پر امتیازی سلوک عام دیکھنے میں آیا۔ خاص طور پر عیسائیوں کو چھوٹی موٹی مزدوری کے سوا کسی جگہ ملازمت حاصل کرنے میں مشکل پیش آئی۔ تاہم عیسائی لیڈروں کا کہنا ہے کہ حالیہ برسوں میں نجی شعبے میں ان کے لئے حصول ملازمت کی صورتحال میں قدرے بہتری آئی ہے۔ ملک کے سب سے پسماندہ طبقے یعنی جبری مشقت کرنے والوں میں عیسائیوں اور ہندوؤں کی تعداد ان کی آبادی کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ غیر قانونی جبری مشقت عام رہی۔ کھیتوں، بھٹوں اور گھروں میں کام کرنے والے مزدوروں کو حقیقتاً غلام بنا کر رکھا گیا۔ ان شعبوں میں جبری مشقت کرنے والے زیادہ تر غیر مسلم تھے۔ جبری مشقت کرنے والے، خواہ وہ مسلم تھے یا غیر مسلم، ایک جیسے حالات میں رہ رہے تھے۔ جون میں پولیس نے صوبہ پنجاب کے ضلع شیخوپورہ میں چھاپے مارے اور بھٹوں پر جبری مشقت کرنے والے 300 سے زیادہ مزدوروں کو رہا کرایا، جن میں زیادہ تر عیسائی تھے۔ اگرچہ نوآبادیاتی دور کے برعکس اب ملازمت کے درخواست فارموں میں مذہب کا خانہ نہیں ہوتا، تاکہ مذہب کی بنیاد پر تعصب نہ برتا جائے، لیکن کئی لوگوں خصوصاً عیسائیوں اور ہندوؤں کے ناموں سے ان کے مذہب کا پتہ چل جاتا ہے۔

دینی مدارس کا معاملہ 11 ستمبر 2001 کے واقعے کے بعد نمایاں طور پر سامنے آیا، کیونکہ ان کے بارے میں یہ خیال کیا گیا کہ انتہا پسند اور دہشت گرد تنظیمیں ان مدارس کو تربیتی کیمپوں کے طور پر استعمال کر رہی ہیں اور وہاں سے دہشت گرد بھرتی کرتی ہیں۔ بعد میں جب چھان بین کی گئی تو پتہ چلا کہ بہت کم مدارس اس طرح کی سرگرمیوں کے لئے استعمال ہو رہے تھے۔ پانچ بورڈز یا وفاق نے، جو ملک کے بیشتر مدارس کو کنٹرول کرتے ہیں، حکومت سے اس بات پر پہلے ہی اتفاق کر چکے ہیں کہ وہ مدارس میں بڑے پیمانے پر اصلاحات کریں گے۔ تمام وفاق المدارس نے ایسی تعلیم ختم کرنے کا حکم دیا، جو مذہبی یا فرقہ وارانہ تشدد کو ہوا دے رہی تھی۔ اسی طرح مدارس سے انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کو بھرتی کرنے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔ اس مقصد کے لئے وفاق المدارس نے انسپکٹر مقرر کئے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ ان احکامات پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ انسپکٹروں کے ذریعے اس بات کو بھی یقینی بنایا گیا کہ وفاق سے الحاق یافتہ مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم بھی پڑھائے جائیں، جن میں انگریزی، ریاضی اور سائنس شامل ہے۔ ان مدارس میں مرحلہ وار جدید علوم متعارف کرائے جا رہے ہیں۔ تاہم اس مقصد کے لئے سرکاری فنڈز کے اجرا میں دفتری تاخیر دیکھنے میں آئی۔ وفاق المدارس نے اس بات کو بھی لازمی قرار دیا کہ غیر ملکی طلبا حکومت کے پاس رجسٹریشن کرائیں گے۔ اسی طرح مدارس کے لئے غیر ملکی نجی فنڈز کے حصول پر بھی پابندیاں لگائی گئیں۔ رجسٹریشن اور امتحانات کے مسائل پر حکومت کے ساتھ سرگرمی سے تبادلہ خیال جاری رہا۔ بعض غیر رجسٹرڈ اور دیوبندیوں کے کنٹرول میں فاٹا اور شمالی بلوچستان

(Posted on July 20, 2006)

میں چلنے والے مدارس میں انتہا پسندی کی تعلیم جاری رہی۔ اسی طرح جماعت الدعویٰ کے تحت چلنے والے مدارس میں بھی انتہا پسندی کی تعلیم دی جاتی رہی اور یہاں سے لشکر طیبہ نامی دہشت گرد تنظیم کے لئے کارکن بھرتی ہوتے رہے۔

انسانی حقوق کی تنظیموں نے دعویٰ کیا کہ خواتین کی توہین وتذلیل کے لئے ان کی آبروریزی کی گئی۔ اقلیتوں کے حقوق کی تنظیموں نے دعویٰ کیا کہ ہندو اور عیسائی عورتیں خاص طور پر آبروریزی کا نشانہ بنیں۔

جب توہین رسالت جیسے مذہبی مقدمات عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں تو ایسے موقع پر اکثر کمرہ عدالت انتہا پسندوں سے بھرا ہوتا ہے، جو ملزم کو بری ہونے کی صورت میں اعلانیہ سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ جج اور مجسٹریٹ، انتہا پسندوں کی کسی کارروائی یا تشدد سے بچنے کے لئے مقدمے کو غیر ضروری طول دیتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملزم کو لمبے عرصہ تک جیل میں رہنا پڑتا ہے، اس کے مقدمے کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں اور اسے بار بار عدالت میں پیش بھی ہونا پڑتا ہے۔

سیکشن iv . حکومتِ امریکہ کی پالیسی

حکومتِ امریکہ نے انسانی حقوق کے تحفظ کی اپنی مجموعی پالیسی کے تحت حکومتِ پاکستان سے مذہبی آزادی کے معاملے پر تبادلہ خیال جاری رکھا۔ امریکی نمائندے اہم مسلم اور غیر مسلم مذہبی تنظیموں سے باقاعدگی سے ملتے رہے اور ان سے تبادلہ خیال کرتے رہے۔ امریکی سفارت خانے کے افسران نے بھی حکومت کے نمائندوں اور مذہبی اور اقلیتی لیڈروں سے رابطہ رکھا تاکہ مذہبی آزادی کی حوصلہ افزائی کی جائے اور مسائل پر بات کی جائے۔ زیر نظر رپورٹ میں جس مدت کا احاطہ کیا گیا ہے، اس کے دوران توہین رسالت قوانین، حدود قوانین، پبلک اسکولوں اور مدارس کے نصاب تعلیم میں اصلاح، احمدیوں سے برتاؤ، فرقہ وارانہ تشدد اور آغا خانیوں کے خلاف بڑھتے ہوئے سماجی دباؤ جیسے مسائل پر خاص طور پر توجہ دی گئی۔ سفیر سمیت امریکی سفارت خانے کے عہدیداروں نے تمام مذہبی برادریوں کے لیڈروں اور ان این جی اوز سے ملاقاتیں کیں، جو مذہبی آزادی کے لئے کام کررہی ہیں۔

سفارت خانے نے حکومت، ارکان پارلیمنٹ اور سرکاری عہدیداروں کے سامنے غیر رسمی انداز میں توہین رسالت قوانین اور حدود قوانین کے غلط استعمال کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار جاری رکھا۔ سفارت خانے کے عہدیداروں نے ایسے متعدد سیمیناروں میں شرکت کی، جو این جی اوز نے متعلقہ لوگوں سے ان کے مسائل پر تبادلہ خیال کے لئے منعقد کئے۔ اس طرح کے مواقع پر سفارت خانے کے عہدیدار اس بات پر زور دیتے رہے کہ حکومت کو چاہیے کہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ان قوانین کا غلط استعمال نہ ہو۔ حکومتِ پاکستان نے جنوری 2005 میں جو نیا قانون منظور کیا، وہ اس سلسلے میں ایک اہم پیشرفت ہے۔ سفارت خانے نے قوانین کے بارے میں عمومی اظہار خیال کے علاوہ پرویز مسیح کیس سمیت مشہور مقدمات اور اپیلوں کا مشاہدہ بھی جاری رکھا اور امریکہ میں متعلقہ لوگوں اور اداروں کو ان کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔

امریکہ نے اصلاح تعلیم کے مجموعی پروگرام کے تحت، جس کی مالیت 100 ملین ڈالر (5.8 ارب روپے) ہے، حکومت پاکستان کو معقول مالی امداد دی تاکہ نصاب تعلیم میں اصلاح کی جائے اور مذہبی عدم رواداری کی تعلیم ختم کی جائے۔

سفارت خانے کے حکام اصلاح مدرسہ پروگرام کی پیشرفت کا باقاعدگی سے مشاہدہ کرتے رہے اور اس پیشرفت کی حوصلہ افزائی

(Posted on July 20, 2006)

کرتے رہے۔ زیر نظر رپورٹ کے عرصہ کے دوران امریکی سفیر نے وزیر مذہبی امور سے ملاقاتیں کیں اور اصلاح کے پروگرام پر پیشرفت پر ان کے خیالات معلوم کئے اور اس بات پر زور دیا کہ حکومت، اس مقصد کے لئے تعاون جاری رکھے۔ امریکی محکمہ خارجہ اور محکمہ تعلیم کے اعلیٰ عہدیداروں نے بھی پاکستان کے وزیر تعلیم کو مدرسہ نظام تعلیم میں تیزی سے اصلاحات کرنے کی ضرورت سے آگاہ کیا۔ سفارت خانے کے حکام نے مذہبی اسکولوں اور سرکاری حکام کے درمیان تعلقات کا جائزہ لینے کے لئے امریکہ میں ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی مدد کی، جو اصلاح مدرسہ پروگرام سے تعلق رکھتے تھے، تاکہ پاکستان کیلئے ایک ممکنہ ماڈل پیش کیا جا سکے۔

سفارت خانے نے احمدی برادری سے ہونے والے سلوک کا بھی بغور مشاہدہ کیا۔ سفارت خانے کے حکام نے مسلم مذہبی لیڈروں سے ملاقاتوں میں ان پر زور دیا کہ احمدی برادری سے افہام وتفہیم پیدا کی جائے اور ان کی ایذا رسانی ختم کی جائے۔ انھوں نے ارکان پارلیمنٹ سے بھی احمدیوں کے مسائل پر بات کی اور کہا کہ احمدی مخالف قوانین کا بتدریج خاتمہ ہونا چاہیے اور جب تک یہ قوانین موجود ہیں، ان کے نفاذ میں نرمی سے کام لیا جانا چاہیے۔

سفارت خانے کے حکام تمام اہم اسلامی تنظیموں کے مذہبی اور سیاسی لیڈروں سے باقاعدگی سے ملاقاتیں کرتے رہے۔ ان ملاقاتوں میں انھوں نے فرقہ وارانہ تشدد کے خاتمے اور مختلف فرقوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے عالمی مذاہب کونسل جیسے بین المذاہب مکالمے اور مختلف فرقوں کے درمیان مکالمے کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے اسلامی نظریاتی کونسل اور وزارت مذہبی امور کے نمائندوں سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان پر زور دیا کہ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے سرگرم کردار ادا کریں۔ امریکی سفیر نے مذہبی امور اور داخلہ امور کے وزراء کے سامنے شمالی علاقوں میں بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ تشدد کا مسئلہ بھی اٹھایا اور حکومت پر زور دیا کہ اصلاح احوال کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ سفیر نے بطور خاص آغا خانیوں پر بڑھتے ہوئے سماجی دباؤ کے مسئلے پر وزیر مذہبی امور کو مراسلہ پیش کیا اور ان سے کہا کہ آغا خانیوں پر تشدد اور ان کے خلاف امتیاز اور ناروا سلوک کے خاتمے کے لئے اقدامات کی ضرورت ہے۔

سفارت خانے نے مذہبی رواداری اور مذہب کے بارے میں بہتر مفاہمت پیدا کرنے کے لئے امریکہ میں بھی پروگرام جاری رکھے۔ اپریل 2004 میں سفارت خانے نے سالانہ ''مطالعہ امریکہ کانفرنس'' کے لئے مالی امداد دی، جس کا اہتمام قائد اعظم یونیورسٹی کے ''ایریا اسٹڈی سنٹر'' نے کیا تھا اور جس کا موضوع تھا: ''امریکہ میں سیاست اور مذہب''۔ اپریل ہی میں Loyola یونیورسٹی کے تھیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے ایک فلبرائیٹ اسکالر نے ادارہ تحقیقات اسلامی کی فیکلٹی کے ساتھ دو ہفتے کام کیا۔ ایک گرانٹ کے ذریعے کراچی کی ایک این جی او نے امریکی دانشوروں کے ساتھ ویڈیو کانفرنسوں کا اہتمام کیا، جن میں جدید دنیا میں مسلمان نوجوانوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے چیلنجوں پر بحث کی گئی۔

سفارت خانے نے لاہور میں ایسٹر کے موقع پر ہونے والے تشدد کے واقعہ سمیت اقلیتوں پر تشدد کے حوالے سے بڑے بڑے مقدمات میں پیشرفت کا بھی مشاہدہ جاری رکھا اور امریکہ میں متعلقہ لوگوں اور اداروں کو اس بارے میں معلومات فراہم کیں۔

سفارت خانے نے مذہبی اقلیتوں سے متعلق مخصوص کیسوں کی پیروی کے لئے انسانی حقوق کی ملکی و غیر ملکی تنظیموں کی بھی مدد کی۔